''مجھے محمود، فاروق اور فرزانہ کی ٹیم میں شامل کرلیں۔''

میں نے درخواست کی۔

''یہ نہیں ہوسکتا۔'' اشتیاق احمد نے انکار کیا۔

یہ تیس سال پرانی بات ہے۔

میں ساتویں میں پڑھتا تھا۔

''مجھے جیرال اور جیکال کی طرح انسپکٹر جمشید کا ولن بنادیں۔''

''ہرگز نہیں۔''

''انسپکٹر کامران مرزا کا ماتحت بنادیں۔''

''ناممکن۔''

''شوکی برادران میں شامل کرلیں۔''

اشتیاق احمد ہنس پڑے۔

''مبشر! کہانیوں کا کردار بننے کا آسان طریقہ بتاؤں؟

خود کہانیاں لکھنا شروع کردو۔

اچھا یہ بتاؤ۔ کسی کہانی میں مجھے کردار بناؤ گے؟

میں نے کہا، ''جی ہاں، ضرور بناؤں گا۔

پکا وعدہ اشتیاق احمد صاحب!''

تحریر: مبشر علی زیدی۔۔۔انتخاب (ادارہ)

ماہنامہ کرن کرن روشنی

تعلیم سے تربیت تک ۔۔۔ علم سے عمل تک

زیر سرپرستی : ملک محمد ممتاز

ماجد حسین ملک

چیف ایڈیٹر:

علی عمران ممتاز

2nd Prize Title 2010

خاص شمارہ قیمت 30 روپے

اشتیاق احمد کی تحریروں پر مشتمل ”انتخاب نمبر“

اور انسان کو وہی ملتا ہے جس کی وہ کوشش کرتا ہے۔ (القرآن)

کرن کرن روشنی آرگنائزیشن کے زیر اہتمام ماہنامہ

تخلیقی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کا عزم

مسلسل کامیابی کا 12واں سال

جنوری/فروری ۔۔۔۔ 2016ء

جلد نمبر ۔۔۔۔۔۔۔ 5

شمارہ نمبر ۔۔۔۔۔۔۔ 7-8

ایڈیٹر : حاجی لطیف کھوکھر

مینجنگ ایڈیٹر : حافظ نعیم احمد سیال

معاون ایڈیٹر: احتشام الحق

سب ایڈیٹر : کاشف علی نیئر

اعزازی ایڈیٹر : امیر علی قریشی، محسن ملک

ڈائجسٹ ایڈیٹر: مجید احمد جائی

سرکولیشن مینجر : تنویر حسین سیال

مجلس مشاورت: مظہر کلیم ایم اے (ایڈووکیٹ)

نذیر انبالوی، طارق ریاض خان، عبداللہ نظامی

نیئر رانی شفق، عبدالصمد مظفر، امان اللہ نیئر شوکت

آرٹ ایڈیٹر : سید محمد کلیم شاہ، مراد ملک

معاونین : ہارونہ آپی، عائشہ کنول، یونس، جاوید فدا حسین

بیورو چیف : سکندر علی، گھوٹکی، راؤ شیر زمان رزاقی، قصور

پبلشر و چیف ایڈیٹر علی عمران ممتاز نے ماہنامہ کرن کرن روشنی

نونہالان وطن کی تعلیم و تربیت اور تعمیری سوچ اجاگر کرنے کیلئے

کرن ذوالفقار پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر

آشیانہ روشنی خونی برج ملتان سے جاری کیا

Visit website:www.kirnkirnroshni.blogspot.com

E-mail: kirnkirnroshni@yahoo.com

خط و کتابت کیلئے

ٹوائی لائٹ کمپیوٹر سٹڈیز

حامد کمرشل سنٹر ممتاز آباد ملتان

0301-7488695

0302-7480855

لاہور دفتر

مکان نمبر 25 گلی نمبر 13

کاردار پارک موہنی روڈ

راوی روڈ لاہور

زر تعاون۔ 20 روپے سالانہ زر تعاون 300 روپے رجسٹرڈ ڈاک زر سالانہ 600 روپے مشرق وسطی: 50 ریال دیگر ممالک: 25 ڈالر

ستمبر/اکتوبر خالق نمبر پارٹ 2 Facebook کے پیج پر پڑھیں - www.facebook.com/kirnkirnroshni

بسم اللہ الرحمن الرحیم

کرن کرن روشنی کے پیارے پڑھنے والو!۔۔۔۔۔۔۔۔السلام علیکم

سو باتوں کی ایک بات

17 دسمبر شام 4 بجے بذریعہ sms پیغام ملا، اشتیاق احمد انتقال کر گئے یہ خبر بچوں کے ادب میں کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ اشتیاق احمد کا نام کون نہیں جانتا، بچوں کے ادب میں اشتیاق احمد کے نام کا باب ہمیشہ کیلئے بند نہیں ہوا بلکہ بچوں کے ادب میں ہمیشہ کیلئے زندہ ہو گیا کیونکہ وہ اپنی کہانیوں کے ذریعے ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ بے شمار کہانیوں کا جو سمندر انہوں نے بچوں کے ادب کیلئے وقف کیا ہے، اس سے رہتی دنیا تک نونہال اپنی پیاس بجھاتے رہیں گے۔ اشتیاق احمد نے بچوں کے ادب میں جاسوسی ناول کا آغاز اور بچوں کا اسلام کے ذریعے بچوں کی تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ لکھاریوں کی بھی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ بطور لکھاری وہ کامیاب رہے تو بطور ایڈیٹر بھی انہوں نے کوئی کمی نہیں چھوڑی، ان کی بچوں کا اسلام میں "دو باتیں" پڑھنے والوں کیلئے مشعل راہ کا کام کرتی ہیں۔ پیارے قارئین! اشتیاق احمد کے بارے میں جتنا بھی لکھا جائے کم ہے سو باتوں کی ایک بات یہ ہے کہ بچوں کا ادب اشتیاق احمد کی رحلت سے یتیم ہو گیا۔

پیارے قارئین! کرن کرن روشنی نے 2002ء میں جنوبی پنجاب میں بچوں کے ادب کے جمود کو توڑتے ہوئے جو اقدامات کئے اب دس سال بعد ہمیں خوشی ہے کہ اس جمود کا مکمل خاتمہ ہو گیا ہے۔ کرن کرن روشنی بارش کا پہلا قطرہ بن کر بچوں کے ادب میں ہلچل مچانے میں کامیاب ہوا اور آج کرن کرن روشنی کے طرز پر جنوبی پنجاب سے شائع ہونے والے پھول پھول خوشبو، بچوں کا گلستان، بزم طلبہ اور جھلمل تارے نے برسات کر کے ثابت کر دیا ہے کہ جنوبی پنجاب میں بچوں کے ادب کی سرزمین زرخیز ہے۔

سو باتوں کی ایک بات کرن کرن روشنی نے جس جمود کو توڑنے کی کوشش کی اس میں کامیاب ہو گیا۔ اب کرن کرن روشنی جنوبی پنجاب میں نئی تاریخ رقم کرنے جا رہا ہے جس کا آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا ہو گا۔

آپ کی آرا کا انتظار رہے گا — والسلام

آپ کا ساتھی علی عمران ممتاز

دل کی بات

السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ!

پیارے کرن کرن روشنی پڑھنے والو! کیسے ہیں اشتیاق احمد صاحب کی کہانیوں پر مشتمل انتخاب نمبر آپ کی خدمت میں پیش ہے۔

اشتیاق احمد بچوں کے ادیب ہیں یہ وہ نام ہے جو کبھی نہیں بھلایا جا سکتا بلا شبہ بچوں کا ادب انہی کی وجہ سے زندہ تھا۔ آج ان کو مرحوم لکھتے ہوئے دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اب تو بس صرف ان کی یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ کتنے ہی خوش نصیب ہوتے ہیں وہ لوگ جو کئی صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں اشتیاق احمد بھی کئی خوبیوں کے مالک انسان تھے۔ ایسے انسان صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے جو کام لینا تھا لے لیا کام کرتے کرتے وہ اللہ کے حضور پیش ہو گئے اور پیچھے ادبی دنیا اور اپنے چاہنے والوں کو سوگوار چھوڑ گئے۔ اللہ انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے (آمین)

سمجھ نہیں آتا ان کے بارے میں کیا لکھوں؟ ایسے لگتا ہے ان کے جانے کے بعد الفاظ ہم سے روٹھ گئے جو بھی لکھتے ہیں لکھا نہیں جاتا۔

دل کے ساتھ ساتھ قلم بھی رو رہا ہے کیوں کہ یہ الفاظ نہیں آنسو ہیں وقت جتنا بھی گزر جائے گا مگر یہ غم ہمیشہ تازہ رہے گا۔ ان کے پڑھنے والے ان کے چاہنے والے ہمیشہ انہیں یاد رکھیں گے۔ ان کی یاد میں ہم نے کرن کرن روشنی کا ان کی تحریروں پر مشتمل انتخاب نمبر شائع کیا تا کہ یہ یاد بھی ان کی ہمیشہ کے لئے محفوظ ہو جائے پیارے قارئین آپ کو انتخاب نمبر کیسا لگا۔ اپنی آراء دینا نہ بھولیئے گا مجھے آپ کی آراء کا شدت سے انتظار رہے گا۔

والسلام
حافظ نعیم احمد سیال

آئینہ عکس

اشتیاق احمد کی کہانیوں پر مشتمل "انتخاب نمبر" میں جن ساتھیوں نے تحریروں کا انتخاب کیا اس کی تفصیل درج ذیل ہے

روشنی

تمہارے رفیق تو حقیقت میں اللہ اور اس کا رسول ﷺ اور اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں۔

(سورۃ المائدہ:55)

خوشبو

پیارے نبی پاک ﷺ نے فرمایا! جس بدن کو حرام غذا دی گئی وہ جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ مشکوٰۃ شریف

حمدِ ربِ جلیل

ضیاء الحسن ضیاؔ

تیرا ہم پہ ہے لطف و کرم اے خدا
دُور کرتا ہے تو سارے غم اے خدا
تُو نے دی ہیں ہمیں نعمتیں بے بہا
شکر تیرا کریں کیوں نہ ہم اے خدا
ہم ہیں بندے ہمارا تُو معبود ہے
تیرے در پر جبینیں ہیں خم اے خدا
پاک دھرتی بنے امن کا گلستان
ختم ہوجائیں ظلم وستم اے خدا
تیرے رستے پہ چلتے رہیں ہم سدا
ہم کو دُنیا میں کر محترم اے خدا
تجھ سے ہر دم ضیاؔ کی یہی ہے دعا
حمد تیری ہی لکھے قلم اے خدا

نعت رسول مقبول ﷺ

ضیاء الحسن ضیاؔ

لب پہ جس دم سجا یانبی ﷺ یانبی ﷺ
دل کی زینت بنا یانبی ﷺ یانبی ﷺ
میری بے چینیاں دُور سب ہوگئیں
میں نے جب بھی کہا یانبی ﷺ یانبی ﷺ
پھول کھلتے گئے راہ بنتی گئی
پیار کا سلسلہ یانبی ﷺ یانبی ﷺ
سارا عالم ہی دیکھ لگا جھومنے
جب کہیں بھی سُنا یانبی ﷺ یانبی ﷺ
ہرمصائب کا حل ذکرِ صل علیٰ
ہر مرض کی دوا یانبی ﷺ یانبی ﷺ
ہر گھڑی ہر نفس اے ضیاء الحسن
ہے وظیفہ مرا یانبی ﷺ یانبی ﷺ

مریم : سورۃ المومنون میں کیا بتایا گیا ہے؟

ماموں جان: اللہ کے رسول حضرت محمد ﷺ کو اس سورۃ میں ہدایت کی گئی ہے کہ کفارِ مکہ آپ کے مقابلے میں خواہ کیسا ہی برا رویہ اختیار کریں آپ بھلے طریقے سے مدافعت کریں شیطان کبھی آپ کو جوش دلا کر برائی میں دبنے پر آمادہ نہ کرسکے۔ آخر میں منکرین دین کو آخرت کی باز پرس سے ڈرایا گیا ہے۔ یہ سورۃ ایک سو اٹھارہ آیات پر مشتمل ہے۔

عائشہ : سورۃ الحج میں حج کے کیا مسائل بیان کئے گئے ہیں؟

ماموں جان : مدینہ منورہ میں نازل ہونے والی اور اٹھہتر (۷۸) آیات پر مشتمل اس سورۃ میں مختلف امور کے ساتھ ساتھ حج اور اس کی مسائل سے آگاہ کیا گیا ہے۔ کفار کا رویہ رہا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کو جھٹلانے میں کمر بستہ رہتے تھے، اور پتھر کی مورتیوں کو اپنا معبود قرار دیتے تھے۔ اس حوالے سے اس سورۃ میں کفار سے پوچھا گیا ہے کہ لوگو! ایک مثال دی جاتی ہے غور سے سنو۔ جن معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کرسکتے بلکہ مکھی ان سے کوئی چیز چھین لے جائے تو وہ اس سے چھڑا بھی نہیں سکتے۔ مدد چاہنے والی بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔ ان لوگوں نے اللہ کی قدر ہی نہ پہچانی، جیسا کہ اس کے پہچاننے کا حق ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوت اور عزت والا تو اللہ ہی ہے۔

راشد : سورۃ الانبیاء میں کیا مختلف نبیوں کا ذکر آیا ہے؟

ماموں جان : اس سورۃ میں حضرت نوح علیہ السّلام، حضرت ابراہیم علیہ السّلام، حضرت ہارون علیہ السّلام، حضرت صالح علیہ السّلام، حضرت لوط علیہ السّلام، حضرت داؤد علیہ السّلام، حضرت سلیمان علیہ السّلام، حضرت اسماعیل علیہ السّلام، حضرت ادریس علیہ السّلام، حضرت ذوالکفل علیہ السّلام، حضرت یونس علیہ السّلام، حضرت زکریا علیہ السّلام کا ذکر کیا گیا ہے۔ جب کہ آقائے دو جہاں حضرت محمد ﷺ کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے،، اے محمد! ہم نے تم کو جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔

اس سورۃ میں وہ کش مکش زیرِ بحث ہے، جو اللہ کے رسول ﷺ اور سرداران قریش کے درمیان برپا تھی۔ کفار کو بتایا گیا ہے کہ جس شخص کو تم اپنے لیے مصیبت سمجھ رہے ہو، وہ دراصل تمھاری ہدایت کے لئے آیا ہے۔ سورۃ الانبیاء مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی۔ یہ ایک سو بارہ آیات پر مشتمل ہے۔

مریم : سورۃ طٰہٰ میں کیا بیان کیا گیا ہے؟

ماموں جان: مکہ مکرمہ میں نازل ہونے والی یہ سورۃ ایک سو پینتیس (۱۳۵) آیات پر مشتمل ہے۔ اس سورۃ میں مختلف مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ ایک دلچسپ واقعہ آدم و ابلیس کا ہے۔

اس واقعہ کا آغاز سورۃ طٰہٰ کی آیت نمبر ۱۱۶ سے ہوتا ہے،، یاد کرو وہ وقت جب ہم فرشتوں سے کہا تھا کہ آدم کو سجدہ کرو وہ سب تو سجدے میں گر گئے مگر ایک ابلیس تھا کہ انکار کر بیٹھا۔

”منجھا ہوا جرائم پیشہ“

تحریر۔ اشتیاق احمد

انتخاب: اَمان اللہ نیّر شوکت، لاہور

اَمان اللہ نیّر شوکت (مدیر اعلیٰ بچوں کا پرستان) اشتیاق احمد کے بارے میں اپنے تاثرات میں کہتے ہیں۔

اشتیاق احمد بچوں کے ادب کے جھلملاتے ستارے تھے۔ میری ان سے 1969 سے علیک سلیک تھی۔ وہ بہت خاموش طبع اور ملنسار انسان تھے۔ وہ بلاشبہ بچوں کے علم و ادب کا سرمایہ تھے۔ اشتیاق احمد کی نثر سے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ ان کا اسلوب بیاں انتہائی سادہ اور شائستہ تھا۔ بچوں کے لیے جاسوسی کہانیاں اور پھر مختلف کرداروں پر مشتمل طویل ناول لکھنے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ وہ بلاشبہ ادب کے نگینہ تھے۔

اشتیاق احمد اب مرحوم ہو چکے ہیں۔ مرحوم کے لغوی معنی ہیں جس پر اللہ تبارک تعالیٰ کی رحمت ہوئی یا جس پر رحمت نازل کی گئی۔ ان معنوں پر غور کریں تو بلاشبہ اشتیاق احمد پر اللہ تبارک تعالیٰ کی رحمت نازل ہوئی اور وہ ہارٹ اٹیک کے دوران قید حیات سے آزاد ہو گئے۔

اللہ تبارک تعالیٰ اشتیاق احمد کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ ایک خوشبو سے اُن کی قبر معطر رہے اور پس ماندگان کو صبر و جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

پروفیسر عابدی کی پیشانی پر پسینے کے بے شمار قطرے چمک اُٹھے۔ ان کے منہ سے مارے خوف کے نکلا:

”اف میرے خدا! یہ کیا ہو گیا۔؟“

”کیا ہوا پروفیسر صاحب! خیر تو ہے۔“ ان کے نائب عرفان غوری نے اُن کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمھیں تو معلوم ہی ہے غوری۔۔۔ میں ان دنوں کس تجربے پر کام کر رہا ہوں۔“

”ہاں پروفیسر صاحب، آپ انسانی عمر میں دو چند اضافے پر تجربات کر رہے ہیں۔ آپ ایسے جراثیم پیدا کرنے کی کوشش میں ہیں۔ جو انسانی جسم میں بیماریوں کے خلاف زبردست قوت پیدا کریں اور اس طرح انسان اپنی طبعی عمر سے دوگنا جی سکے۔ گویا اگر آپ کامیاب ہو جاتے ہیں تو انسان کی عمر ڈیڑھ پونے دو سو سال تک ہو سکے گی۔۔۔ یہی ناں پروفیسر صاحب!“

”ہاں غوری! لیکن جانتے ہو۔۔۔ ہوا کیا ہے۔؟“

”کیا ہوا ہے۔؟“ عرفان غوری نے بے چینی کے عالم میں پوچھا۔

”ہوا اس کے الٹ ہے۔۔۔ آؤ۔۔۔ میں تمھیں دکھاتا ہوں۔۔۔ میرے تجربات سے وجود میں آنے والے جراثیم کیا گل کھلا رہے ہیں۔

”جی۔۔۔ کیا کہا۔ گل کھلا رہے ہیں۔“

”ہاں۔۔۔ آؤ۔۔۔“

وہ اُسے اسکرین کے سامنے لے آئے۔۔۔ اب انہوں نے ایک بٹن دبایا اور بولے۔

”دیکھو غوری! یہ ہے شیشے کا وہ جار جس میں، میں نے ان جراثیم کی افزائش کی ہے۔۔۔ اور یہ رہا دوسرا جار۔۔۔ اس میں انسانی جسم کے سُرخ خلیے موجود ہیں۔۔۔ ان خلیات کی بھی میں نے افزائش کی ہے۔۔۔ اب اگر میں جار نمبر ایک میں سے چند جراثیم جار نمبر دو میں شامل کر دوں تو کیا ہونا چاہیے بھلا۔؟“

پروفیسر عابدی کہتے کہتے رُک گئے۔

”کیا ہونا چاہیے۔؟“ عرفان غوری نے قدرے حیران ہو کر کہا۔

”ہاں! سامنے کی بات ہے۔۔۔ انسانی عمر میں اضافہ اس صورت میں ممکن ہے جب سُرخ خلیات کی پیداوار میں اضافہ ہوتا چلا جائے۔۔۔ کیونکہ جب انسانی جسم میں سرخ خلیات مر جاتے ہیں تو آدمی موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔“

”آپ کا مطلب ہے، جب آپ جار نمبر دو میں اپنے جراثیم داخل کریں گے تو اُس میں سُرخ ذرات میں اضافہ ہونے لگے گا۔“

”ہاں بالکل ٹھیک اور اس طرح عمر میں اضافہ ممکن ہو جائے گا۔“

”آپ کا خیال ٹھیک ہے۔۔۔ تب پھر اس میں پریشانی کیا لاحق ہو گئی۔“

”معاملہ بالکل اُلٹ ہو گیا ہے۔“ پروفیسر عابدی کے چہرے پر اب ہوائیاں اڑتی نظر آ رہی تھیں۔

”مہربانی فرما کر وضاحت کریں۔۔۔ کیا ہو گیا ہے۔“

”میں نے جار نمبر ایک میں سے چند جراثیم جار نمبر دو میں منتقل کیے تو میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ گیا کہ میرے جراثیم سُرخ خلیات کو بہت تیزی سے کھا رہے ہیں۔“

”کیا!!!!“ عرفان غوری چلا اُٹھے۔

ہاں غوری۔۔۔ بالکل یہی بات ہے۔۔۔ اور یہ منظر تم خوردبین کی مدد سے صاف دیکھ سکتے ہو۔۔۔ لو دیکھ لو۔“

یہ کہتے ہوئے پروفیسر عابدی نے خوردبین غوری کو تھما دی اُس نے خوردبین پر آنکھ جما دی۔۔۔ اُسے جار نمبر دو میں سُرخ خلیات بہت تیزی سے غائب ہوتے نظر آئے۔

”آپ۔۔۔ آپ ٹھیک کہتے ہیں پروفیسر۔۔۔ لیکن آپ کے لیے اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔؟“

”بات ہے۔۔۔“ وہ پُرزور انداز میں بولے۔

”اور۔۔۔ وہ کیا؟“

”یہ جراثیم جار نمبر ایک میں محفوظ ہیں۔۔۔۔ یہ اپنی افزائش میں خود بخود اضافہ کرتے چلے جائیں گے۔۔۔ یعنی ایک جار سے دو اور اس سے چار جار بھرے جا سکتے ہیں جبکہ ان کی بہت تھوڑی سی مقدار اگر انسانی جسم میں داخل کر دی جائے تو آدمی بہت جلد مر جائے گا۔۔۔ شاید چند دن میں یا شاید چند ماہ میں۔۔۔ ابھی میں مدت کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔۔۔ اور مزے کی بات یہ ہے کہ کوئی ڈاکٹر۔۔۔ کوئی لیبارٹری ٹیسٹ موت کی وجہ نہیں بتا سکے گی۔۔۔ گویا ایک سُرنج کے ذریعے چند جراثیم کسی کے جسم میں داخل کر دو۔۔۔ بس وہ زندگی کی بازی ہار جائے گا۔۔۔ اب ذرا سوچو غوری۔۔۔ یہ جراثیم جرائم پیشہ لوگوں کے ہاتھ لگ جائیں تو وہ ان سے کتنی تباہی مچا سکتے ہیں۔۔۔ انسانیت پر کتنی بڑی تباہی لا سکتے ہیں۔۔۔ تم شاید سمجھ نہیں رہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔۔۔ سنو غوری فرض کیا ہم واٹر سپلائی ٹینک میں یہ جراثیم شامل کر دیں۔۔۔ تو کیا ہو گا۔؟“

”اوہ۔۔۔ اوہ!!“ عرفان غوری اچھل پڑے۔ اب اس کی آنکھوں میں بھی خوف تھا۔ پھر آہستہ آہستہ یہ خوف دُور ہو گیا اور خوف کی جگہ طنز نے لے لی۔ پھر یہ طنز اور گہرا ہو گیا، لیکن پروفیسر عابدی اس کی کیفیت سے بے خبر اسکرین پر سُرخ خلیات کو غائب ہوتے دیکھ رہے تھے۔ انہیں تو اُس وقت پتہ چلا جب کوئی ٹھنڈی چیز ان کی گدی سے آ لگی۔ وہ چونک کر مڑے۔ اُسی وقت عرفان غوری کی سرد آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی۔

”حرکت نہ کرنا پروفیسر۔“

''کک۔۔۔کیا مطلب۔۔یہ۔۔۔یہ کیا غوری۔۔۔'' مارے حیرت اور خوف کے پروفیسر عابدی کے منہ سے نکلا۔

''اب ان جراثیموں سے فائدہ میں اُٹھاؤں گا۔ جرائم پیشہ لوگوں کو میں فروخت کروں گا اور وہ ان کے ذریعے لاکھوں کروڑوں کمائیں گے۔ میرا مطلب ہے کرائے کے قاتلوں کو۔۔۔لیکن اُن کی چابی میرے ہاتھ میں ہوگی۔ میں اُنہیں جراثیم فروخت کروں گا تو وہ کچھ کر سکیں گے ناں۔۔۔اس طرح میں دِنوں میں مال دار ترین آدمی بن جاؤں گا۔۔۔کرائے کے قاتلوں کو یہ خوف نہیں رہ جائے گا کہ وہ پکڑے جائیں گے۔ وہ ہر قسم کی مشقت سے بچ جائیں گے۔'' یہاں تک کہہ کر عرفان غوری رُک گیا۔

''نہیں غوری! ایسا ظلم نہ کرنا۔۔یہ جراثیم انسانیت کے لیے بہت خطرناک ہیں۔ ہمیں تو انسانیت کی بھلائی کے لئے کام کرنا ہے۔۔۔نہ کہ اُن کی تباہی کے لیے یہ دولت تمھارے کچھ بھی کام نہیں آئے گی۔ اِس خیال کو جھٹک دو۔ یہ پستول میری گدی سے ہٹالو۔۔۔میں اس جار کو آگ میں ڈال دیتا ہوں۔۔۔اس صورت میں ہم پُرسکون زندگی گزار سکیں گے۔۔۔یا پھر ہم یہ جراثیم حکومت کے حوالے کر دیں گے۔۔۔وہ دشمن ممالک پر انہیں استعمال کر سکتی ہے۔۔۔''

''بھاڑ میں جاؤ پروفیسر تم۔'' یہ کہتے ہی اُس نے گولی چلا دی۔

پروفیسر عابدی کے منہ سے ایک دل دوز چیخ نکلی اور ان کا جسم تڑپنے لگا۔ مرتے مرتے بھی اُنہوں نے بمشکل کہا۔

''نن۔۔نہیں۔۔۔غوری نہیں۔۔۔ایسا ۔۔۔ایسا نہ۔۔۔کرنا۔۔'' اور اس کے ساتھ ہی اُن کی روح پرواز کر گئی۔

''یہ۔۔۔یہ تم نے کیا کیا غوری اب پولیس تمھیں نہیں چھوڑے گی۔'' اپنے پیچھے آواز سُن کر غوری جلدی سے مڑا۔۔۔پھر مسکرا کر بولا۔

''آخر۔۔۔رانا یہ شخص اِسی قابل تھا۔۔۔اس کا ارادہ یہ تھا کہ ان جراثیموں کو تباہ کر دے یا حکومت کے حوالے کر دے۔ حکومت اس پر مزید تجربات کرے اور ملکی سطح پر ان جراثیموں سے فائدہ اٹھایا جائے۔۔۔لیکن تم خود سوچو۔۔بھلا اس سے ہمیں کیا ملتا۔۔اصل فائدہ تو ہمیں اب ہوگا۔''

''لیکن مجھے۔۔۔آخر ہم کیسے فائدہ اُٹھا سکیں گے۔''

''میں وہ نہیں جو نظر آتا ہوں۔۔۔میں نے پروفیسر کے نائب کے طور پر یہاں ملازمت صرف اس لیے کی تھی کہ قانون کی نظروں سے بچا رہوں۔۔۔ورنہ میں ایک منجھا ہوا جرائم پیشہ رہا ہوں۔ جرائم کی دُنیا سے میرا تعلق پہلے ہی ہے۔۔۔اب ان جراثیموں کی بدولت اور زیادہ تعلق قائم ہو جائے گا تم دیکھنا۔۔دولت ہم پر کس طرح برسے گی۔''

''لیکن۔۔۔تم قرابی کا کیا کرو گے۔؟''

''میں نے سب سُن لیا ہے۔۔۔میں غوری کا ساتھ دوں گا۔۔۔'' ایک اور آواز آئی۔

''تب میں بھی ساتھ ہوں۔ رانا نے فوراً کہا۔ تینوں نے گرم جوشی سے ہاتھ ملائے۔۔۔پھر غوری نے کہا۔

''البتہ چوکیدار کا کچھ کرنا ہوگا ہو سکتا ہے، اسے اندر ہونے والے واقعے کی سُن گن لگ چکی ہو۔۔۔اسے اندر بلا کر پوچھ لیتے ہیں۔۔۔اس کے چہرے کے تاثرات سے پتا چل بھی جائے گا۔۔۔اگر اس کی رائے ہمارے خلاف ہوئی تو ہم اُسے بھی ختم کر دیں گے۔۔۔اور اس جگہ کو چھوڑ دیں گے۔

''ٹھیک ہے۔۔۔رانا۔۔۔تم جا کر اُسے لے آؤ۔ ہم صورت حال اُس کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔۔۔پھر دیکھا جائے گا۔''

جلد ہی رانا چوکیدار کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ وہ پروفیسر عابدی کی لاش کو دیکھ کر بُری طرح اُچھلا۔ اس کی آنکھوں میں خوف دوڑ گیا۔

''یہ۔۔۔یہ۔۔۔یہ کیا؟''

''سنو نور خان، ہم تمھیں ساری بات بتا دیتے ہیں۔ اس کے بعد فیصلہ تمھارے ہاتھ ہوگا۔ ہمارا ساتھ دینا پسند کرو گے تو ہم اِسی تجربہ گاہ کو اپنا اڈہ بنا لیں گے اور اگر تم نے ساتھ دینا پسند نہ کیا تو پھر ہمارے راستے الگ ہوں گے۔''

''مم۔۔۔میں سمجھا نہی۔''

''ہم تمھیں سمجھا دیتے ہیں۔''

اور غوری نے ساری بات اُس کے سامنے رکھ دی۔ نور خان کا چہرہ خوشی سے پھول گیا۔ اُس نے اُچھل کر کہا۔

''میں تم لوگوں کا ساتھ دوں گا دوستو۔۔۔اب ہم دُنیا کے مالدار ترین آدمی بن جائیں گے۔''

''بہت خوب! یہ ہوئی ناں بات! اب ہم اپنے کام کی تیاری شروع کرتے ہیں۔ تم اِس لاش کے لیے ایک گڑھا کھود دو۔۔۔ہم شہر سے جا کر کچھ سامان خرید لاتے ہیں۔۔پھر آرام سے بیٹھ کر منصوبہ بندی کریں گے۔''

''ٹھیک ہے۔۔میں تم لوگوں کے آنے سے پہلے اس لاش کا نام ونشان مٹا دوں گا۔ تمام آثار ختم کر دوں گا۔۔یوں بھی شہر سے باہر موجود اس تجربہ گاہ پر کون شک کر سکتا ہے۔۔جاؤ۔۔۔اور جلدی لوٹ آنا۔۔کیونکہ لاش کی وجہ سے مجھ پر گھبراہٹ طاری ہو گئی ہے۔''

''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں نور خان! یہ صرف ایک لاش ہے۔۔۔یہ تمھیں کچھ بھی نہیں کہے گی۔''

عرفان غوری ہنس دیا۔

پھر وہ تینوں چلے گئے اور نور خان اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ تین گھنٹے بعد ان تینوں کی واپسی ہوئی۔۔وہ سامان سے لدے پھندے تھے۔۔۔اُنہوں نے دیکھا کہ تجربہ گاہ کی صفائی ہو چکی تھی اور لاش وہاں موجود نہیں تھی۔ ''تو تم نے اُسے ٹھکانے لگا دیا۔''

''ہاں ساتھیو!''

''تب پھر تم بھی اِسی سفر پر روانہ ہو جاؤ۔۔۔ہم نے فیصلہ کیا ہے اس کاروبار میں تین سے زیادہ ساتھی نہیں ہونے چاہئیں۔''

''کیا مطلب۔؟'' نور خان بہت زور سے اُچھلا۔ اس کی آنکھوں میں خوف پھیل گیا۔

''آنے والی دولت کو ہم چار کے بجائے تین کیوں نہ تقسیم کریں۔ تمھیں کیوں حصہ دار بنائیں لو تم بھی جاؤ۔''

ان الفاظ کے ساتھ ہی وہاں ایک فائر ہوا۔۔۔لیکن جواب میں نور خان کی چیخ سُنائی نہیں دی تھی۔ بلکہ چیخ عرفان غوری کی تھی۔ اس کے ساتھیوں نے اس کے ہاتھ سے خون تیزی سے بہتے دیکھا۔ ساتھ ہی آواز گونجی۔ ''تم لوگ ہاتھ اوپر اُٹھا لو۔''

اس آواز کے ساتھ ہی کمرے میں پولیس اور فوج کے چند جوان آ گئے۔۔۔ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں لگا دی گئیں۔۔۔ان میں سے ایک فوجی ان سے کہہ رہا تھا۔

''تم منجھے ہوئے جرائم پیشہ ہو گے لیکن نور خان ایک منجھا ہوا ریٹائرڈ فوجی ہے۔ اس نے قوم اور ملک سے غداری کرنا نہیں سیکھا۔ تم نے ایک بے گناہ کے خون سے ہاتھ ہی نہیں رنگے۔ قوم کو ایک مفید شخصیت سے محروم بھی کیا ہے۔ سزا تو تمھیں ملنا تھی۔ لیکن اس قدر جلد سزا کا ملنا، اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمھارا یہ فعل کچھ زیادہ ہی گھناؤنا تھا۔ ورنہ جرائم پیشہ تو تم کب سے چلے آ رہے ہو۔۔۔ تمھارے ان جرائم پر تمھیں فوری سزا نہیں ملی لیکن اس جرم پر فوری پکڑ ہو گئی۔ سنا تم نے منجھے ہوئے جرائم پیشہ انسان۔''

فوجی آفیسر کے لہجے سے گہرا طنز اور دکھ جھلک رہا تھا۔☆☆☆

”احسان مند“

از۔۔۔ڈاکٹر طارق ریاض خان لاہور

کہا جاتا ہے شخص مرجاتا ہے لیکن شخصیت زندہ رہتی ہے۔لیکن کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو دلوں میں ،کاغذوں میں ،تحریروں میں اور تاریخ میں زندہ رہتے ہیں۔مرحوم اشتیاق احمد بھی گنتی کے ایسے نامور افراد کی فہرست میں شامل ہیں جو اپنی سادہ ،باغ و بہار دھیمی شخصیت اور جادوگر قلم کے حامل لکھاری کی حیثیت سے امر ہوگئے۔

سینکڑوں ناول ،ہزاروں کہانیوں کے خالق تاریخ کا حصہ بن گئے اور میرے جیسے لاکھوں لوگ جو ادب نواز ،قاری اور لکھاری ہیں۔خوش قسمت ٹھہرے کہ ہم اشتیاق احمد کے عہد میں زندہ ہیں اور ہم میں سے کئی اُن کے احباب ٹھہرے ،کچھ ملاقاتی اور بے شمار قاری۔

مجھے افسوس ہے کہ اشتیاق احمد جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔میری اُن سے زیادہ ملاقاتیں نہ ہوسکیں ۔بچپن میں ٹاون شپ لاہور میں ”طارق عادل لائبریری“ بنائی (عادل ریاض ایڈووکیٹ میرے چھوٹے بھائی ہیں) والد صاحب نے سینکڑوں کتابیں لاکر دیں۔لائبریری خوب چلی ۔اس کے طفیل بے شمار لوگ مستفید ہوئے۔جن میں میرے جیسا طالب علم بھی شامل تھا۔جس کی طلب اشتیاق احمد صاحب کے ناولوں نے پوری کی۔

درجنوں ناول اور کہانیاں پڑھ کر لہو گرم کیا۔آپ سے میری پہلی ملاقات اسلام آباد دعوۃ اکیڈمی 1996،دوسری ملاقات 2004 بک فیئر میں اور تیسری ملاقات بک فیئر 2007 میں ”آفاق“ کے اسٹال پر ہوئی۔میں نے انہیں حلیم ،بردبار،شفیق ،سادہ دل ،سادہ لوح ،صابر و شاکر اور انسان دوست پایا۔وہ ہر بار ایسے ملے جیسے برسوں پرانے یارانے ہوں۔مجھے چائے پیش کی ،قلم تحفے میں دیا ،موبائل نمبر دیا ،سب سے بڑھ کر مجھے ”سائنسی بابو“ کہہ کر مخاطب کیا۔ہر ملاقات میں اُنہیں اللہ تعالیٰ کا شکر کرتے دیکھا۔کوئی تکبر ،کوئی غرور اور اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھنے جیسی کوئی اخلاقی بیماری بھی آپ میں نہ دیکھی۔17 نومبر 2015 کو عزیز برادر محبوب الٰہی مخمور ایڈیٹر بھیا ماہنامہ انوکھی کہانیاں کراچی نے مجھے وصال کی اطلاع دی تو سر گھوم کر رہ گیا۔لیکن مشیت ایزدی کے سامنے کون ٹھہر سکتا ہے۔اشتیاق احمد صاحب بارگاہ الٰہی میں پیش ہوگئے ۔پروردگار سرکار مدینہ ﷺ کے وسیلے سے آپ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔ آمین۔

بچوں کا جاسوسی ادب ہمیشہ ان کا احسان مند رہے گا۔جب تک دُنیا میں بچوں کا ادب لکھنے اور پڑھنے والے موجود ہیں ،اشتیاق احمد صاحب کا نام ایک حوالہ بن کر زندہ رہے گا۔

روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

”دس سال بعد“

تحریر: اشتیاق احمد

انتخاب: عبداللہ نظامی ،لیہ

عبداللہ نظامی (چیف ایڈیٹر ماہنامہ تعمیر ادب لیہ) اشتیاق احمد کے بارے میں کہتے ہیں

زاویہ کا نام آتے ہی بابا اشفاق احمدؒ یاد آتے ہیں ،اور جاسوسی ناولوں اور بچوں کے ادب کا ذکر آئے تو بابا اشتیاق احمدؒ کا نام بے اختیار زبان پہ آجاتا ہے ،اشتیاق احمدؒ کی شخصیت کا احاطہ چند سطور میں کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے ،وہ ہمہ جہت شخصیت ،بلند پایہ ادیب ،نقاد ،مصنّف ،ناول نگار اور کہانی کار کے ساتھ ساتھ صوفی منش انسان تھے ،ان کا تخلیق کردہ ادب بلاشبہ وطن عزیز کا قومی اثاثہ ہے ،ساری زندگی انہوں نے گوشہ نشینی کے ساتھ اپنا کام کئے رکھا ،اشتیاق احمد نے جاسوسی ناولوں اور کہانیوں کے ذریعے بے مثال ادب تخلیق کیا ،ان کی بچوں کے لئے لکھی گئی تعمیری اور سبق آموز کہانیاں اور ناول ہر طبقہ عمر میں پسند کئے جاتے ہیں ،ان کا جذبہ حب الوطنی اور دین اسلام سے محبت اس بات کی مظہر ہے کہ وہ سچے پاکستانی اور پکے مسلمان تھے اور یہی توقعات وہ نسل نو سے وابستہ کئے رہے ،وہ اپنی تحریروں میں نوجوانوں کو نظریہ پاکستان اور اسلام کی تلقین کرتے رہے ،اللہ کرے ان کی یہ امیدیں بار آور ثابت ہوں اور خداوند کریم ان کو جوار رحمت میں بلند مقام عطا فرمائے ۔

ابا جان کے فوت ہونے پر ہم سب نے سکھ کا سانس لیا۔جب سے ہم نے ہوش سنبھالا تھا ،وہ ہمارے سروں پر سوار ہی رہے تھے۔انہوں نے ہماری زندگی اجیرن بنا دی تھی ۔ہمیں نہ دن کو چین ملتا ،نہ رات کو آرام۔سچ تو یہ رہا ہے کبھی کبھی ہم جھنجھلا کر کہہ اُٹھتے تھے۔

”اللہ کرے! یہ مرجائیں۔“

یہ دعا کرنے کے بعد اگرچہ ہمیں غصہ بھی آتا تھا کہ آخر ایسا بھی کیا۔ہیں تو ہمارے ابا جان ۔ایسی دعا تو غیر کے لیے نہیں کرنی چاہیے۔ہم دل ہی دل میں خود کو بُرا کہتے اور تہیہ کر لیتے کہ آئندہ ایسی دعا ہرگز نہیں مانگیں گے۔لیکن پھر جھنجھلاہٹ کا کوئی ایسا موقع آجاتا کہ یہ دعا منہ سے نکل ہی جاتی۔

اب پتا نہیں ۔۔۔یہ کیسے ہوا؟ اچانک اُنہیں دل کا دورہ پڑا اور وہ دوسری دُنیا کو سدھار گئے۔پہلے تو ہمیں یقین ہی نہ آیا ،جب ڈاکٹر صاحب کے اطمینان دلانے پر یقین آیا کہ یہ واقعی فوت ہوچکے ہیں۔تو دلوں اور دماغوں پر سے ایک بوجھ سا ہٹتا ہوا محسوس ہوا ۔۔بلکہ یوں لگا جیسے ہمارے سینوں پر ایک سِل تھی جو ہٹ گئی ہے۔ہم نے لمبے لمبے سانس لئے اور پھر ان کے کفن دفن کی تیاریوں میں لگ گئے۔اور تو اور ہم نے صاف طور پر محسوس کیا تھا کہ ہماری امی جان نے بھی ان کے مرنے کی خبر سُن کر سکون کا سانس لیا تھا۔وہ بھی ہماری ہی طرح ان سے بہت تنگ تھیں ۔۔۔وہ تو کہہ دیا کرتی تھیں

”اللہ! ایسے میاں کسی کو نہ دے ۔۔۔اور ایسا باپ بھی کسی کو نہ دے۔“

تین دن ہمارے گھر میں خوب رونا دھونا رہا ۔۔ہم سب خوب

روئے۔شروع کے چند آنسو ضرور دُکھ کے آنسو تھے۔اُس کے بعد والے آنسو تو ہم نے زبردستی نکالے تھے۔۔نکالنا پڑے۔ورنہ لوگ کیا کہتے۔۔۔یہ باپ کے مرنے پر روئے تک نہیں۔۔کیسی اولاد ہے اور امی جان کو تو آس پاس کی عورتوں کے خوب خوب طعنے ملتے۔کیسی سخت دل بیوی ہے۔میاں بے چارے اپنی جان سے گئے اور یہ ٹسوے بھی نہ بہا سکیں۔لہذا اس قسم کے جملوں سے صاف بچ کر نکلنے کے لیے آنسو نکالنا آسان تھا سو نکالے اور خوب نکالے۔۔۔بھئی آج کل مصنوعی آنسو نکالنا کیا مشکل ہے۔آنکھیں بے چاری آنسو بہانے کو تیار ہو جاتی ہیں۔ہمیں تو اس بارے میں ویسے بھی کئی اور طریقے آتے تھے۔لہذا لوگوں نے خوب خوب تعریفیں کیں۔۔واقعی۔۔۔انہیں اپنے باپ سے بہت محبت تھی۔۔۔ان کی والدہ کو اپنے خاوند سے کس قدر محبت تھی۔۔۔تبھی تو رو رو کر آنکھیں سُرخ کر لی ہیں۔پھر تین دن بعد سب بہکاوے ختم ہو گئے۔۔ہم نے سوچا،اب ہم مدتوں بعد گھوڑے بیچ کر سوئیں گے۔۔خوب جی بھر کر نیند کے مزے لوٹیں گے،صبح ہمیں کوئی نماز کے لیے نہیں اُٹھائے گا۔کوئی ٹی،وی کے آگے بیٹھنے سے نہیں روکے گا،کوئی گانا سننے سے منع نہیں کرے گا صبح سے ہماری عیش ہی عیش ہو گی۔

اس سوچ کے ساتھ ہم لمبی تان کر سو گئے۔صبح سویرے کسی کے اٹھانے اُٹھانے کا فکر جو نہیں تھا۔لمبی تانتے تو اور کیا کرتے۔

دوسرے دن ہم آٹھ بجے تک سوتے رہے۔۔مدتوں بعد آرام کا سونا ملا تھا،پھر تو یہ ہمارا معمول بن گیا،ہم نماز روزے سے دُور ہوتے گئے۔اور باقی سب چیزوں سے نزدیک ہوتے گئے۔۔۔ہم اپنے آپ میں مگن ہو گئے۔۔۔کبھی سوچا بھی نہیں کہ ابا جان کے ہوتے ہوئے ہمارے معمولات کیا تھے اور اب کیا ہو گئے۔

ہم نے پورے دس سال اسی بے فکری کی حالت میں گزار دیئے۔دس سال بعد جا کر اچانک ہمیں معلوم ہوا۔۔ابا جان کے ہوتے ہوئے گھر میں جو کچھ تھا۔۔۔آہستہ آہستہ وہ سب ختم ہو گیا تھا۔

اب ہمارے سامنے تنگدستی کا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔اس پہاڑ سے ٹکرانے کی ہم میں بالکل ہمت نہیں تھی۔۔۔ہم سب تو آرام طلبی کے انتہائی رسیا بن چکے تھے۔

☆☆☆

سورۃ یاد کرو انعام لو

پیارے بچو!

سورۃ کہف یاد کر کے اپنے سکول پرنسپل کو سنائیں اور سکول کے لیٹر پیڈ پر اپنے نام و پتہ کے ساتھ تصدیق کروا کر ارسال کریں

انچارج: راؤ شیر زمان رزاقی

تعاون: بزم انوار رزاقیہ، چک 14 قصور

انعام یافتگان

☆ جمشید بیگ، لاہور۔☆ خرم زبیر، ملتان

☆ زین جمشید، لاہور۔☆ حسنین رضا، سرگودھا

☆ حفیظ احمد، جلال پور پیروالا

”کیسی دعوت“

تحریر: اشتیاق احمد

معروف افسانہ نگار اور شاعرہ نیئر رانی شفق کہتی ہیں
اشتیاق احمد ایک ایسے لکھاری تھے جو صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں ہمیں ان کی کہانی کا شدت سے انتظار رہتا تھا بچپن میں ان کی ایک قسط وار کہانی چھلاوا جو آج تک نہیں بھولتی میرے پاس ریکارڈ میں نہیں تھی ورنہ وہ کہانی انتخاب کے طور پر بھیجتی۔بچوں کے ادب میں بچوں کے اسلام کی ذریعے لکھاریوں کی حوصلہ افزائی کرنے کا جو انداز اشتیاق احمد نے اپنایا وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔انوار احمد خان چونک اُٹھے۔اُنھوں نے کھانا کھاتے ہوئے مہمانوں سے کہا۔میں ابھی آیا آپ کھائیں یہ کہہ کر دروازے پر آئے۔دروازہ کھولا تو ان کے قریبی دوست عبدالخالق کھڑے تھے۔انہیں دیکھ کر انوار احمد خان قدرے پریشان ہو گئے۔انوار کو پریشان دیکھ کر فوراً پوچھا۔خیر تو ہے میرے دوست! آپ مجھے دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ہاں تھوڑی سی پریشانی محسوس ہوئی ہے دراصل میں نے کچھ لوگوں کو شام کے کھانے پر بلایا ہوا ہے وہ اس وقت کھانا کھا رہے ہیں اور میرا ان کے پاس ہونا ضروری ہے ورنہ وہ کیا خیال کریں گے اور آپ آئے ہیں آپ کے پاس بیٹھنا بھی ضروری ہے اب آپ سوچیں گے شاید میں آپ کو کھانا نہیں کھلانا چاہتا۔ایسی بات بھی نہیں ہے لیکن مشکل یہ ہے انوار احمد یہ کہتے کہتے رُک گئے۔خالق نے پوچھا کھانے کے معاملے میں مشکل کہاں سے آ ٹپکی اگر آپ مجھے کھانا کھلانا پسند کرتے ہیں تو میں بھی خوش ہو کر کھاؤں گا ہاں اگر کسی قسم کا بوجھ یا ناگواری محسوس کرتے ہیں تو میں واپس چلا جاتا ہوں،پھر کسی وقت آ جاؤں گا۔نہیں نہیں ایسی بھی کوئی بات نہیں ہے۔آپ کو معلوم نہیں انوار احمد پھر کہتے کہتے رُک گئے۔چلیے جو مجھے معلوم نہیں،وہ تو بتا دیں۔اچھا خیر آپ آئیں خود ہی جان جائیں گے۔وہ انہیں ساتھ لیے کھانے والے کمرے میں داخل ہوئے۔عبدالخالق کو ایک زبردست جھٹکا لگا انہوں نے جو منظر دیکھا۔اس کو دیکھنے کی انہیں ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں،کمرے میں ایک صاف ستھری چٹائی بچھی تھی،چٹائی پر دستر خوان اور اس پر طرح طرح کے کھانے سجے تھے،کھانے تیار کرنے میں بہت تکلف سے کام لیا گیا تھا۔عام طور پر ایسے کھانے اس وقت تیار کیے جاتے ہیں جب بہت خاص قسم کے مہمانوں کو بلایا جائے لیکن کمرے میں جو لوگ موجود تھے۔وہ پھٹے پرانے کپڑوں میں بہت خوشی خوشی بیٹھے کھانے میں مگن تھے۔ان کے اندر داخل ہونے پر اُنہوں نے نظریں اُٹھائیں اور پھر کھانے میں مصروف ہو گئے۔آیئے آپ بھی کھانے میں شریک ہو جائیں۔انوار احمد نے کہا۔وہ بھی بیٹھ گئے اور کھانا کھانے لگے۔انوار احمد ان سب کے آگے بڑھ بڑھ کر ڈشیں پیش کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے یہ بھی لیجیے نا یہ بھی چکھیں،آپ کے لیے خاص طور پر یہ چیز تیار کرائی ہے۔آپ تو کچھ کھا ہی نہیں رہے۔عبدالخالق کی حیرت کا کیا پوچھنا۔آخر مہمان کھانے کے بعد رخصت ہو گئے۔انوار احمد نے انہیں باعزت طریقے سے رخصت کیا۔دروازے تک گئے پھر واپس لوٹ آئے۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ پوچھتے۔انوار احمد خود ہی بولے۔میں کبھی کبھی ایسے لوگوں کی دعوت کرتا رہتا ہوں۔دولت مندوں کی دعوت تو سبھی کرتے ہیں۔ان جیسوں کی بھی تو کرنی چاہیے۔عبدالخالق کا سر شرم سے جھک گیا وہ سوچ رہتے تھے اس قدر نیکی کا کام کبھی انہیں کیوں نہیں سوجھا۔

☆☆☆

سامنے والی کوٹھی

تحریر: اشتیاق احمد

انتخاب: محمد زبیر ارشد، ملتان

اشتیاق احمد کی کہانیاں پڑھنے کا بچپن سے اشتیاق تھا اور جس میگزین میں ان کی کہانی یا ناول شائع نہ ہوا ہوتا وہ پھیکا پھیکا لگتا۔ اشتیاق احمد نے اپنی ساری زندگی ادب کی خدمت میں گزاری۔ غالباً لکھنا اور بہترین لکھنا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ میری زندگی کا وہ قیمتی ترین لمحہ تھا جب لاہور میں منعقد ہونے والی بزم اسلام کی سالانہ تقریب میں ادیبوں کے جھرمٹ میں ان سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے بہت گرمجوشی سے ملاقات کی۔ جاسوسی ناولوں کے ماؤنٹ ایورسٹ شخصیت سے مل کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ آپ ہمیشہ ہر تقریب میں مختصر تقریر کیا کرتے۔ آپ زیادہ بول کر قیمتی وقت کو ضائع کرنا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔

بوڑھے نے دلھن کی طرح سجی کوٹھی کو حیرت سے دیکھا۔ کوٹھی نور کا ٹکڑا لگ رہی تھی۔ بہت سے مرد اور عورتیں کوٹھی کا رُخ کر رہے تھے۔ کاریں آ آ کر رُک رہی تھیں۔ مہمان ان سے اتر کر کوٹھی کی طرف جا رہے تھے۔ ایسے میں ایک پیدل نوجوان اس بوڑھے کے پاس گزرنے لگا، اس کا رُخ بھی کوٹھی کی طرف تھا: ”ذرا بات سننا بیٹا!“

نوجوان ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے نظر بھر کر بوڑھے کو دیکھا، پھر بولا: ”جی فرمائیے۔“

”آپ بھی اس کوٹھی میں جا رہے ہیں نا؟“

”جی ہاں۔“ اس نے کہا۔

”آج یہاں کیا ہے؟“

”یہ کوٹھی سردار احمد بیگ کی ہے، ان کے ہاں پہلا بیٹا پیدا ہوا ہے۔ اس خوشی میں انہوں نے اپنے دوستوں کو دعوت دی ہے۔“

”سردار احمد کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔“ بوڑھے کی آواز مارے خوشی کے بے قابو ہونے لگی۔

”ہاں! کیوں کیا بات ہے۔ کیا آپ جانتے ہیں انھیں؟“

”میں؟ ہاں میں تو انہیں جانتا ہوں، وہ مجھے نہیں جانتے۔ بڑے کاروباری آدمی ہیں نا۔“

”جی ہاں یہ تو ہے۔ ان کی تو بہت دھوم ہے۔ آپ کو ان سے کوئی کام تو نہیں۔“

”نہیں بیٹا! میں تو بس یوں ہی کوٹھی کی دھوم دیکھ کر آپ سے پوچھ بیٹھا تھا۔ آپ کا شکریہ۔ ویسے کسی زمانے میں میرا ان سے بہت گہرا تعلق تھا۔ اس تعلق کی بنیاد پر مجھے چاہئے کہ کم از کم انھیں بیٹے کی پیدائش پر مبارک باد تو دے دوں۔ کیا خیال ہے اگر میں مبارک کے دو چار جملے لکھ کر آپ کو دے دوں تو آپ انھیں دے دیں گے۔“

”کیوں نہیں، ضرور دوں گا۔“

”اچھی بات ہے، میں ابھی لکھے دیتا ہوں۔“

یہ کہہ کر بوڑھے نے جیب سے کاغذ نکالا اور لکھنے لگا۔ پھر کاغذ تہ کر کے اس کی طرف بڑھا دیا:

”یہ لو بیٹا! انھیں دے دینا۔ وہ سمجھ جائیں گے کون آیا تھا۔“

”جی اچھا، لیکن بڑے صاحب! اگر آپ کا ان سے قریبی تعلق رہا ہے تو آپ ان سے مل کیوں نہیں لیتے۔“

”آج یہاں لوگوں کی دعوت ہے نا، میرا اندر جانا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہوگا۔ لوگ خیال کریں گے کھانے کیلئے اندر گھس آیا ہے، ظاہر ہے میری وضع قطع ایسی تو ہے نہیں کہ مہمان نظر آسکوں۔ ہوں، اچھا ٹھیک ہے۔ آپ فکر نہ کریں میں یہ انھیں دے دوں گا۔“

”جیتے رہو بیٹا! کیا نام ہے آپ کا؟“

”جی میرا نام کاشف خان ہے۔“

”کاشف خان!“ بوڑھے نے دہرایا۔

”جی ہاں، یہی نام ہے۔“

”اچھا شکریہ۔ میں چلتا ہوں۔“

وہ مڑنے لگا، اس وقت کاشف خان نے بوڑھے کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے دیکھ لیے، لیکن وہ کچھ پوچھ نہ سکا۔ البتہ اس نے الجھن ضرور محسوس کی، پھر وہ کوٹھی کی طرف قدم اٹھانے لگا۔ دروازے پر پہنچ کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا، بوڑھا چلا گیا ہے یا ابھی کھڑا ہے۔ اس نے دیکھا بوڑھا بھی چلتے چلتے مڑ کر کوٹھی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ایک بار بوڑھے کی نظر اس پر بھی پڑی۔ اس نے جلدی سے رخ موڑ لیا اور قدم اٹھانے لگا۔ جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گیا کاشف خان کوٹھی کے اندر داخل نہ ہو سکا۔

بوڑھے کے نظروں سے اوجھل ہونے پر اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ اب وہاں پہلے کی نسبت اور زیادہ بوجھ محسوس ہوا۔ وہ اس بوجھ کو نہ سمجھ سکا۔ آخر اندر داخل ہو گیا۔ دعوت شروع ہو چکی تھی۔ لوگ خوب جوش و خروش سے کھانے میں مصروف تھے۔ سردار احمد بیگ کی مصروفیت کا تو عالم ہی اور تھا۔ بار بار اِدھر اُدھر دوڑ کر مہمانوں کو پوچھ رہا تھا۔ کاشف خان نے اس پر ایک نظر ڈالی۔ کاغذ اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے سوچا اس وقت یہ کاغذ اسے دینا مناسب نہیں ہوگا۔ اول تو اس کے پاس پڑھنے کا وقت ہی نہیں ہے، یوں ہی اِدھر اُدھر کاغذ گرا دے گا۔ وہ نزدیک تو رہتا ہی ہے، کل کسی وقت دے دے گا۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ دوسرے دن رات کے وقت اس نے سردار احمد بیگ کے دروازے پر دستک دی۔ ملازم باہر آیا تو اس نے سردار احمد کو پیغام بھیجا کہ وہ سردار صاحب سے ملنا چاہتا ہے۔ کاشف خان ان کا قریبی پڑوسی تھا اور سردار احمد بیگ اس نوجوان کو بہت پسند کرتا تھا۔ کبھی کبھار وہ اس سے گھر کا کوئی کام کاج بھی لے لیتا تھا۔ اس نے فوراً ہی اسے اندر بلوا لیا۔

علیک سلیک کے بعد اس نے پوچھا: ”کہیے کاشف صاحب کیسے آئے؟“

”میں کل جب دعوت میں شرکت کیلئے آ رہا تھا تو آپ کی کوٹھی سے ذرا فاصلے پر ایک بوڑھا آدمی کھڑا نظر آیا تھا۔ اس نے مجھے یہ پرچہ دیا تھا اور کہا تھا، یہ آپ کو دے دوں، لیکن اس وقت آپ بہت مصروف تھے، میں نے سوچا آج فرصت میں دے دوں گا۔“

”آپ نے اچھا کیا کاشف میاں، آپ کا شکریہ!“ یہ کہہ کر سردار احمد بیگ نے کاغذ لے لیا۔ اس پر لکھے الفاظ پڑھ کر اس نے کاغذ جیب میں ڈال لیا۔

”اچھا! میں چلتا ہوں۔“

"چائے نہیں پئیں گے؟"

"پھر سہی۔"

اور وہ چلا آیا۔ ایسے میں اس نے کئی بار چاہا کہ پوچھ لے، بوڑھا کون تھا، لیکن پوچھ نہ سکا۔ اس واقعے کو کئی دن گزر گئے۔ اسے بار بار بوڑھے کا خیال آتا رہا۔ آخر آہستہ آہستہ وہ اسے بھول ہی گیا۔

☆☆☆

اس شام وہ اپنے دفتر سے فارغ ہو کر گھر آ رہا تھا۔ سردار احمد بیگ کی کوٹھی کے قریب سے گزرتے ہوئے وہ بہت زور سے چونکا۔ وہی بوڑھا کھڑا تھا غیر ارادی طور پر اس کے قدم اس کی طرف اٹھنے لگے: "السّلام علیکم بڑے صاحب!"

بوڑھا چونک اٹھا۔ نظریں اس کے چہرے پر جما دیں۔ چند سیکنڈ تک دیکھتا رہا، آخر بولا: "آپ، آپ وہی تو نہیں جنہیں میں نے اس دن پیغام لکھ کر دیا تھا۔"

"جی ہاں! میں وہی ہوں۔ آپ آج پھر یہاں نظر آ رہے ہیں۔"

"میں مہینے میں ایک بار یہاں ضرور آتا ہوں۔"

"لیکن کیوں؟"

"بس اس کوٹھی کو ایک نظر دیکھنے کے لئے......اور ......"

"اور کیا؟" کاشف خان جلدی سے بولا۔

"اور اس کوٹھی والوں کی خیریت معلوم کرنے کیلئے۔ دراصل میرے گاؤں میں ایک پاگل عورت رہتی ہے، بس وہ ضد کرتی ہے کہ میں یہاں آؤں اور ان کی خیریت کی خبر اسے سناؤں۔"

"وہ کون ہے؟ آپ کس گاؤں میں رہتے ہیں؟"

"سندر گاؤں میں، میرا نام ابرار احمد ہے۔"

یہ کہتے ہوئے بوڑھا جانے کیلئے مڑا۔ پھر اس نے السّلام علیکم کہا اور قدم اٹھا دیئے۔ کاشف اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایک بار پھر وہی بوجھ اس کے دل پر آ سوار تھا۔ اچانک بڑبڑایا: "میں اس بوجھ سے نجات ضرور حاصل کروں گا۔"

اتوار کے دن وہ سندر گاؤں کا رخ کر رہا تھا اور وہاں پہنچ کر ابرار احمد کا گھر تلاش کرنا ذرا بھی مشکل ثابت نہ ہوا۔ اس نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازے پر دستک دی۔ وہ وقت صبح کا تھا۔ گاؤں شہر سے زیادہ دور نہیں تھا۔ دروازہ کھلا تو ابرار احمد کی حیرت زدہ آواز سنائی دی: "اوہ، یہ آپ ہیں، آئیے اندر آ جائیے۔"

"کون ہے میاں صاحب؟" اندر سے بوڑھی عورت کی آواز سنائی دی۔

"شہر سے کوئی صاحب آئے ہیں۔"

اس نے کہا اور اسے اندر لے آیا۔ چھوٹا سا گھر تھا، دو کمرے کا۔ اس کی ہر چیز سے غربت ٹپک رہی تھی۔

"کیسے آئے بیٹا؟"

"میں اپنی الجھن دور کرنے کے لیے آ گیا ہوں۔ امید ہے، آپ محسوس نہیں کریں گے۔ آپ کا سردار بیگ صاحب سے کیا رشتہ ہے۔ آپ وہاں کیوں جاتے ہیں؟"

"یہ کوئی نہیں کہانی نہیں، دنیا میں ایسا ہوتا ہی رہا ہے۔ ہمارے ساتھ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ بس وہ زیادہ پڑھ لکھ گیا نا، ہم گنواروں کو اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔"

"تو کیا وہ آپ کو اخراجات دیتے ہیں۔"

"اخراجات کی ہمیں ضرورت نہیں۔ ہم دونوں مل کر دو وقت کی روٹی کما لیتے ہیں۔ دیہات میں اتنا کام سبھی کو مل جاتا ہے۔ کٹائی کا موسم ہے سبزیاں توڑنے کا کام، یہ کام سارا سال چلتے رہتے

ہیں۔"

"مطلب وہ آپ سے ملتے بھی نہیں۔"

"اگر ملتے تو یہ وہاں جا کر باہر ہی باہر سے کیوں آنے لگے۔"

بڑھیا درد بھرے انداز میں لمبا سانس بھر کر بولی۔

"آپ نے اس دن کاغذ پر کیا لکھ کر دیا تھا؟"

"یہ کہ مبارک ہو، بہت آرزو تھی تمھارے ہاں بیٹا پیدا ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم دونوں تڑپتے رہ جاتے۔ اب بہت سکون ہے، وہ پیدا ہو گیا ہے جس کا انتظار تھا۔ بس یہ لکھ کر دے آیا تھا۔"

"اس کا کیا مطلب، وہ پیدا ہو گیا جس کا انتظار تھا۔"

"بیٹے! تم ناشتا کس چیز سے کرتے ہو، چائے یا لسی۔"

"مطلب یہ کہ آپ میرے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے۔"

"یہ میری اور اس بڑھیا کی خواہش ہے۔ سردار کا بیٹا بھی خوب پڑھے لکھے، بہت کاروباری آدمی بنے اور......اور......"

"اور کیا؟" بوڑھے نے بے چین ہو کر کہا۔

"مجھے آگے کیا کہنا چاہئے سردار کی ماں۔"

"وہ ایک ایسی خواہش ہے جس کو ہم بیان نہیں کر سکتے۔ کوشش کریں تب بھی۔" بڑھیا بولی۔

"لیکن بیٹا! ایک وقت آئے گا جب تمھیں اس سوال کا جواب خود بخود مل جائے گا۔"

"مم، میرا بوجھ اتر گیا۔ اب میں کوئی بے چینی محسوس نہیں کر رہا۔" کاشف خاں کے منہ سے نکلا۔

"اللہ کا شکر ادا کرو میاں۔"

پھر وہ ان کے گھر کا سادہ ناشتا کر کے وہاں سے چلا آیا۔ تیس سال بعد اسے اس سوال کا جواب مل گیا۔ سردار احمد بیگ کا کاروبار ان تیس سالوں میں بالکل ختم ہو چکا تھا۔ کوٹھی بک چکی تھی اور اب وہ کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ بڑھاپا اس پر بری طرح سوار ہو چکا تھا، تاہم اس نے اپنی کاروباری زندگی میں اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم ضرور دلوائی تھی۔ اس کی ایک بڑے گھرانے میں شادی بھی کر دی تھی اور اب وہ ایک بڑا سرکاری افسر بن چکا تھا۔ باپ سے الگ کہیں اور رہتا تھا۔ کاشف خان اس روز کسی دوست سے ملنے گیا تو ایک شان دار سی بجی کوٹھی کے سامنے اسے بوڑھا سردار احمد کھڑا دکھائی دیا۔ اسے ایک جھٹکا لگا۔ اس کے قدم خود بخود اس کی طرف اٹھ گئے۔

"سردار صاحب! یہ...... یہ آپ ہیں۔"

سردار احمد بیگ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ کئی سیکنڈ تک دیکھتا رہا۔ پھر بولا: "اچھا یہ آپ ہیں کاشف خان۔"

"ہاں! آپ نے ٹھیک پہچانا، لیکن آپ یہاں کیسے کھڑے ہیں۔"

"وہ سامنے والی کوٹھی دیکھ رہے ہیں۔ یہ...... یہ میرے بیٹے کی ہے۔ آج اس کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے۔"

"اوہ......اوہ!"

کاشف خان دھک سے رہ گیا۔ اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

بڑے سے بھی بڑا

تحریر: اشتیاق احمد

انتخاب: محمد عرفات ظہور، ملتان

معروف لکھاری عرفات ظہور اشتیاق احمد کے بارے میں کہتے ہیں کہ اشتیاق احمد بہت بڑے بچوں کے ادیب گزرے ہیں، بچوں کے ادیب میں آپ کو ایک خاص مقام حاصل تھا، آپ بہت متقی اور پرہیز گار انسان تھے، ایک بار آپ ایک پروگرام میں کراچی تشریف لے گئے، وہاں سے واپسی پر ائرپورٹ پر حرکت قلب بند ہو جانے پر آپ کا انتقال ہو گیا اشتیاق احمد نے اپنی ساری زندگی بچوں کے لیئے وقف کر رکھی تھی آپ کی تحریروں میں بچوں کے لیئے اصلاح اور رہنمائی ہوتی ہے، میری اشتیاق احمد صاحب سے پہلی ملاقات اسلام آباد دعوہ اکیڈمی کی ایک تربیتی ورکشاپ میں ہوئی تھی اور میں انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کہ اتنے بڑے ادیب اور اتنے سادہ انسان ہیں، اس پروگرام میں اشتیاق صاحب سے بہت سیکھنے کا موقع ملا اس کے بعد کی دو تین ملاقاتوں میں بھی وہ بہت خوشی اور شفقت سے ملے، آپ نے 800 سے زائد ناول لکھے آپ کی کہانیوں کے کردار ہماری زندگی کے زندہ کرداروں میں سے ہوتے ہیں اور رہتی دنیا تک زندہ رہیں گے آج اشتیاق احمد نہیں رہے مگر ان کے لکھے لفظ ان کے لکھے ناول ان کی لکھی کہانیاں ہمارے پاس موجود ہیں اور آئندہ نسلوں کی اصلاح کرتی رہیں گی، اللہ تعالٰی اشتیاق احمد صاحب کی مغفرت فرمائیں آمین۔

"دیکھو بیٹا تمہیں بڑا آدمی بننا ہے۔۔" دادا جان نے مجھے دونوں ہاتھ سے بھینچتے ہوئے کہا۔

"لیکن دادا ابو۔ کتنا بڑا؟" میں ان کے بھینچنے کی طاقت سے بوکھلا کر بولا۔۔۔ کیونکہ مجھے اپنی پسلیاں تسبیح کرتی محسوس ہوئی تھیں اور یہ آج کی بات نہیں۔۔۔ روز کی تھی۔۔۔ وہ مجھے ہمیشہ اسی طرح دباتے تھے۔۔اور بڑا بننے کے لئے کہتے تھے۔

"بھئی بہت بڑا۔۔۔ بلکہ بہت بڑے سے بھر بڑا۔" وہ بھرپور انداز میں مسکرائے۔

"آپ کا مطلب ہے۔۔ مینار پاکستان جتنا بڑا۔" میں نے جلدی سے کہا۔

"ارے نہیں میرے بیٹے۔۔۔ اتنے بڑے بن کر تم کیا کرو گے۔ تمہیں دیکھنے کے چکر میں سب کے سروں سے ٹوپیاں زمین پر گر جایا کریں گی۔"

انہوں نے منہ بنایا۔

"آپ خود ہی تو کہہ رہے تھے۔۔۔ بہت بڑے سے بھی بڑا۔"

"بڑے سے مطلب یہ کہ تم اپنا نام روشن کرو۔۔۔ اتنے مشہور ہو جاؤ کہ پورے ملک کے لوگ تمہیں اس طرح جانیں۔۔ جیسے۔" وہ کہتے کہتے رک گئے۔

"جیسے میاں نواز شریف۔" میں نے ان کی مشکل آسان کرنے کی کوشش کی۔

"ارے نہیں بھئی۔۔۔ یہ اقتدار تو آنی جانی چیز ہے۔۔۔ آج ہے۔۔۔ کل نہیں ہو گا۔۔۔ اچھی ایک ڈیڑھ سال پہلے ملک کے وزیر اعظم میاں نواز شریف تھے کیا۔" "جی۔۔۔ جی نہیں۔۔۔ وہ تو خیر نہیں تھے۔"

"اور آج میاں نواز شریف صاحب کو سب جانتے ہیں۔۔۔ کل جب وہ وزیر اعظم نہیں ہوں گے تو بہت کم ان کا ذکر اخبارات میں اور چینلوں پر آئے گا۔۔۔ تو تم ایسے شخص کیوں نہ بنو جو ملک کی پیشانی پر ہمیشہ چمکو۔"

"ملک کی پیشانی۔۔۔ دادا ابو ملک کی پیشانی بھی ہوتی ہے۔۔۔ خیر آپ کوئی نام بتائیں تاکہ آسانی سے میری سمجھ میں آجائے۔" میں نے قدرے بے چینی سے کہا۔

"اچھی بات ہے۔۔۔ میں نام لے دیتا ہوں۔۔۔ تم ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی طرح اپنا نام روشن کرو۔۔۔ انہوں نے اپنا ہی نہیں۔۔۔ اپنے ملک کا نام بھی روشن کیا ہے۔"

"اب میں سمجھا۔۔۔ دادا جان اگر میں مینار پاکستان سے چھلانگ لگا دوں تو کیا میں بڑا آدمی بن جاؤں گا یا نہیں۔"

دادا جان نے مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔۔۔ جیسے کچا ہی چبا ڈالنا چاہتے ہوں۔۔۔ پھر بولے: "اس طرح تم بڑے آدمی نہیں بنو گے۔۔۔ قبر میں جا سوؤ گے۔"

"تب پھر آپ ہی بتائیں۔۔۔ آخر میں بڑا آدمی کس طرح بنوں۔۔۔ اس کی کوئی ترکیب بھی تو بتائیں نا۔"

"ترکیب۔۔۔" دادا جان نے پریشان ہو کر ادھر ادھر دیکھا جیسے ادھر ادھر پڑی کوئی ترکیب تلاش کر رہے ہوں۔۔ پھر انہوں نے چونک کر کہا: "وہ مارا۔۔۔ آ گئی بات ذہن میں۔"

"اللہ کا شکر ہے۔" میں نے خوش ہو کر کہا۔

"اور بات یہ ذہن میں آئی ہے کہ تم ایک نامور ڈاکٹر بن جاؤ۔۔ پورے ملک کے لوگوں کا مفت علاج کرنا۔۔۔ اس طرح تم ملک کے بہت بڑے آدمی بن جاؤ گے۔؟

"لل۔۔۔ لیکن کیسے دادا جان۔۔ آخر میں بیٹھے بٹھائے۔۔۔ اچانک ڈاکٹر کیسے بن جاؤں گا۔۔۔ وہ بھی اتنا مشہور کہ پورے ملک کے لوگ مجھے جانیں پہچانیں گے۔"

"تو بڑے انجینئر بن جاؤ" انہوں فوراً کہا۔

"وہی تو میں کہہ رہا ہوں۔۔۔ بڑا انجینئر کیسے بن جاؤں"

"محنت سے۔۔۔ پڑھ لکھ کر۔۔۔ جیسے سب پڑھتے ہیں۔۔۔"

"جیسے سب پڑھتے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر کہا۔

"ہاں! جیسے سب پڑھتے ہیں۔۔۔"

"لیکن دادا جان۔۔۔ سب لوگ تو بڑے آدمی نہیں بن جاتے۔"

"یار شوکی!" انہوں عینک کے شیشوں میں سے مجھے گھورا۔

"جی دادا جان"

"تم تو چاٹ جاؤ گے میرا دماغ۔۔۔ بڑا آدمی نہیں بننا تو نہ بنو۔۔ میرا دماغ نہ چاٹو۔۔۔ میرے لئے ایک کپ چائے بنا لاؤ۔"

"چچ چائے۔۔ لل۔۔ لیکن۔۔" میں گڑبڑا گیا۔

"لیکن کیا؟"

"میں نے تو آج تک چائے کبھی نہیں بنائی۔"

"اوہ! ہاں۔۔ لاحول ولاقوۃ۔۔ میں تو بھول ہی گیا۔۔۔ تمہیں تو چائے بنانی آتی ہی نہیں۔۔۔ ویسے آنی چاہیے۔۔۔ اپنی باجی سے کہو۔"

"جی اچھا دادا جان۔"

میں گھر کے صحن سے اٹھ کر باجی کے پاس چلا آیا۔۔۔ وہ سویٹر بن رہی تھیں اور اس میں اس طرح مگن تھیں کہ انہیں میرے نزدیک پہنچنے کا بھی پتا نہ چلا: "بب باجی۔" میں مشکل سے بولا۔

"ہاں! کیا ہے" ان کا انداز پھاڑ کھانے جیسا تھا۔

''جی باجی جی۔۔۔وہ۔۔۔دادا جان پوچھ رہے ہیں۔۔بڑا آدمی کیسے بنا جاتا ہے۔''

''ہائیں۔۔۔یہ پوچھا ہے انہوں نے۔۔۔یہ انہیں کیا سوجھی؟''

وہ بولیں میں گھبرا گیا۔۔۔میں تو بالکل بھول گیا تھا:''مم۔۔۔معافی چاہتا ہوں۔۔۔وہ کہہ رہے ہیں۔۔۔ایک کپ چائے بنا دیں۔''

''او اچھا۔۔لیکن تم نے وہ بات کیسے کہہ دی تھی؟''

''وہ۔۔دادا جان مجھ سے کہہ رہے تھے۔۔۔شوکی۔۔۔تمہیں بڑا آدمی بننا ہے۔۔۔بلکہ بہت بڑا۔۔بڑے سے بھی بڑا۔''

''بڑے سے بھی بڑا۔''انہوں حیران ہو کر کہا۔۔۔ساتھ ہی وہ اٹھ کر باورچی خانے کی طرف چلیں۔

''جی ہاں!بڑے سے بھی بڑا۔''

''لیکن شوکی۔۔۔تم اتنے بڑے بن کر کیا کرو گے۔''

''یہ تو دادا جان سے ہی۔۔۔پوچھیں۔۔۔وہ کہہ رہے تھے۔۔۔اتنے مشہور آدمی بن جاؤ کہ پورا ملک تمہیں جان جائے۔''

''اوہ۔۔بہت اچھا۔۔بہت دلچسپ بات ہے شوکی۔۔۔لیکن ایسا ہوگا کیسے۔۔۔آخر تم اتنے بڑے۔۔۔مم۔۔۔میرا مطلب ہے۔۔۔اتنے مشہور آدمی کیسے بن سکتے ہو۔''

''باجی۔۔۔اس کا سیدھا سادا جواب تو یہ ہے کہ جیسے دوسرے بنتے ہیں۔۔۔اسی طرح میں بھی بن جاؤں گا۔''

''لیکن شوکی۔۔۔دوسرے سب تو نہیں بن جاتے۔۔۔کوئی کوئی بنتا ہے۔''

''تو ان کوئی کوئی میں سے میں بھی بن جاؤں گا۔''

''ہاں جواب معقول ہے۔۔۔خیر میں سوچوں گی۔۔۔بلکہ دادا جان سے بھی کہتے ہیں۔۔۔وہ بھی سوچیں۔۔۔یہی نہیں۔۔ہم یہ بات آج رات ابا جان اور امی جان کے سامنے بھی رکھیں گے کہ آخر شوکی اپنے ملک کا مشہور معروف اور بڑا۔۔۔بلکہ بہت بڑے سے بھی بڑا آدمی کیسے بن سکتا ہے۔''

''ترکیب خوب ہے۔۔۔آج رات۔۔۔سونے سے پہلے اس پر بات ہوگی اور خوب اچھے انداز میں ہوگی۔''

باجی۔۔۔آپ جواب نہیں۔۔۔آپ بہت اچھی ہیں۔''

''بس بس۔''انہوں نے میرے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

رات کے وقت جب سب سونے کے لئے لیٹنے لگے تو باجی نے سب کو مخاطب کر کے کہا:

''دادا جان کی خواہش ہے کہ۔۔شوکی بڑا آدمی بنے۔۔بلکہ بہت بڑا بنے۔۔یہی نہیں۔۔۔بہت بڑے سے بھی بڑا بنے۔''

''ل۔۔۔لیکن۔۔۔یہ۔۔۔یہ کیسے ہوگا''ابا جان نے حیران ہو کر کہا۔۔۔امی جان بھی پوری دلچسپی سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔

''ہاں!سوال تو یہ ہے کہ یہ ہوگا کیسے۔''

''اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ جیسے دوسرے لوگ بہت بڑے بنے تھے۔''دادا جان نے کہا۔

''اوہ ہاں۔۔واقعی بات درست ہے۔۔۔ترکیب اس کی یہ ہے کہ دنیا کے مشہور معروف اور بہت بڑے لوگوں کی زندگیوں کے حالات پر لکھی کتابیں خرید کر لاؤں گا۔۔۔ہم سب ان کا مطالعہ کریں گے۔۔۔اور جاننے کی کوشش کریں گے۔۔کہ یہ سب بڑے بڑے لوگ آخر اتنے بڑے کیسے بنے؟''

''بہت زبردست ترکیب ہے ابا جان۔''میں نے اور باجی نے ایک ساتھ کہا۔۔امی جان اور دادا جان بھی زوردار انداز میں سر ہلا رہے تھے۔۔۔

☆۔۔۔☆

بڑے بڑے لوگوں کی زندگیوں کے حالات پر کتابوں کی گویا گھر میں بہار آ گئی تھی۔۔۔سب ان میں گم ہو گئے تھے۔ہر ایک کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔۔۔اس طرح باری باری کتابیں تبدیل ہوتی رہیں اور ہم سب نے سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔۔۔پھر ایک رات ابا جان نے سونے سے پہلے سب سے پوچھا۔۔۔''ہاں!سب بتائیں۔سب کے سب کس نتیجے پر پہنچے؟''

سب کی نظریں ابا جان پر جم گئیں۔۔۔۔جیسے کہہ رہے ہوں۔۔ابا جان۔۔۔اس سوال کا جواب آپ ہی دے دیں تو بہتر ہوگا۔

''انہوں نے بھی جان لیا کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔۔لہٰذا ٹھہرے ہوئے انداز میں کہنے لگے۔''ان سب کتابوں کے مطالعے کے بعد میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ بڑا آدمی بننے کے لئے پہلے چھوٹا بننا پڑتا ہے۔''

ہم سب نے کوئی جواب نہ دیا۔۔۔بس خالی خالی آنکھوں سے ابا جان کی طرف دیکھنے لگے۔۔۔آخر باجی نے کہا:''آپ کی بات اگرچہ ہماری سمجھ میں آ گئی ہے۔۔لیکن اس کے باوجود ہم چاہتے ہیں،آپ اس بات کی وضاحت کر دیں۔''

''ہاں ضرور کیوں نہیں۔۔۔سب بڑے لوگوں کی کہانیاں پڑھ کر میں نے یہ جان لیا ہے۔۔۔یہ سب کے سب بچپن سے بڑے نہیں تھے۔بلکہ بچپن سے ہی انہوں نے چھوٹے سے چھوٹے کام کی طرف خوب بلکہ خوب تر توجہ دی۔۔دھیان دیا،دلچسپی لی۔۔مثلاً شوکی۔۔اگر اس وقت تیسری جماعت میں ہے تو اسے اپنی کلاس کا سب سے لائق۔۔۔سب سے تیز اور سب سے زیادہ نمبر لینے والا بننا ہوگا۔۔۔ہر چھوٹے سے چھوٹے ٹیسٹ کی تیاری سالانہ امتحان کے انداز میں کرنا ہوگی۔تبھی اس کی کامیابی اس کلاس میں یقینی ہوگی۔اور اس طرح ہر کلاس میں یہ کامیابی کے جھنڈے گاڑ سکے گا۔۔۔منزلیں خود بخود طے ہوں گی اور ایک دن شوکی اتنا بڑا بن جائے گا۔جتنا بڑا کہ اس کے دادا چاہتے ہیں۔''

''آپ۔۔۔آپ کا مطلب ہے۔۔۔مینار پاکستان جتنا۔''امی جان نے چونک کر پوچھا۔۔۔اور سب مسکرانے لگے۔

سال 2015 کے آخری 4 مہینے

سال 2015 کے آخری 4 مہینے بچوں کے ادب پر بہت بھاری گزرے ہیں ان ماہ میں بچوں کے ادب کی نامور شخصیات بچوں کا اسلام کے مدیر اشتیاق احمد،ماہنامہ ذہین لاہور کے مدیر ظہور الدین بٹ،ماہنامہ کوثر لاہور کے مدیر نسیم الدین خواجہ اور ماہنامہ تعلیم و تربیت لاہور کے سابقہ مدیر کمال احمد رضوی کی رحلت بچوں کے ادب کو سوگوار کر گئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَیْهِ رَاجِعُوْن
ان کے انتقال سے بچوں کے ادب میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔ادارہ کرن کرن روشنی ان کے لئے دُعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ ان عظیم شخصیات کو قبر میں کروٹ کروٹ راحت نصیب کرے۔آمین

دُوسرا مالک

تحریر۔۔۔اشتیاق احمد

انتخاب: عائشہ خان

معروف ادیبہ عائشہ خان اپنے تاثرات میں اشتیاق احمد کے بارت میں کہتیں ہیں

معروف کہانی نویس اور ناول نگار اشتیاق احمد ادب کی دُنیا میں ایک طویل عرصہ سے معروف تھے۔اُن کی نثر میں ایک پاکیزہ جذبہ موجزن ہے۔ان کی محبت ،انسان دوستی، خلوص اور لگن اس کے بُنیادی عناصر ہیں جو جذبوں کو مہمیز کر کے فکر و تخیل کو اظہار پر مجبور کرتے ہیں۔وہ اپنی نثر میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔اُن کی ادبی شخصیت مسکراہٹوں سے لبریز تھی۔

اشتیاق احمد کو بچوں کے ذہین کی ہر ابتداء اور ہر انتہا کا بخوبی علم تھا کہ بچے کیا پسند کرتے ہیں اور کیا نہیں۔وہ اِس حقیقت سے خوب واقف تھے۔وہ بچوں کی ذہنی استعداد کو حقیقت کے تناظر میں انتہائی آسان زبان میں بیان کر دیتے تھے۔وہ بچوں کے لیے بچوں کی زبان میں لکھتے۔الفاظ سادہ اور عام فہم ہوتے جنہیں بچے بڑی آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔موضوعات کا انتخاب ماحول اور بچوں کی دلچسپی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے کرتے تھے۔

اشتیاق احمد بچوں کے نو آموز قلم کاروں کے لیے رہنما اور محقق ہی نہیں تھے۔وہ ایک سُلجھے ہوئے بچوں کے دانشور بھی تھے اور جاسوسی ادب کے بانی بھی۔

"بیٹے!تم اس دُکان کو دیکھ رہے ہو۔؟"

"ہاں دادا جان۔۔۔!بہت زبردست دُکان ہے۔۔ہر وقت گاہکوں کا ہجوم رہتا ہے ،لیکن اس کا مالک ہے بہت عجیب انسان۔۔۔ارے!ام۔۔۔مگر۔۔۔آپ نے کیوں پوچھا اس کے بارے میں۔؟"

توقیر نے چونک کر دادا جان کی طرف دیکھا۔۔۔وہ اب تک اس دکان کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔

"پہلے تم بتاؤ۔۔۔تم نے اس دُکان کے مالک میں کیا عجیب بات دیکھی ہے۔؟"

"آپ دیکھ رہے ہیں۔۔۔عید قریب ہے۔۔خریداروں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہیں۔دُکان داروں کو سر کھجلانے کی فرصت نہیں۔رات کو ایک دو بجے کبھی دُکان بند کرتے ہیں ۔۔ان حالات میں بھی اس دُکان کا مالک عجیب ہے۔۔۔جوں ہی اذان کی آواز سُنائی دیتی ہے۔۔پھٹ سے "وقفہ برائے نماز" کا بورڈ دُکان کے دروازے پر لٹکا دیتا ہے۔اور پھر تو کوئی لاکھ ضد کرے۔۔یہ سودا فروخت نہیں کرتا۔۔۔کہتا ہے رمضان کے دن ہیں۔۔۔ایک نماز کا ثواب ستر گناہ ہے آج کل۔۔۔رمضان کے روزے اور رمضان کے دنوں میں مسجد میں باجماعت نمازیں تو میں نہیں چھوڑ سکتا۔

اب یہ صاحب۔۔۔دکان سے مسجد چلے جاتے ہیں۔۔میں نے دادا جان ۔۔۔!بہت اچھی طرح گھوم پھر کر دیکھا ہے۔۔۔ پورے بازار میں ان دنوں نماز کے لیے اس طرح کوئی بھی نہیں جاتا ،بس صرف یہ جاتا ہے۔

ارے!ام۔۔مگر۔۔آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کیوں مجھے اِس

دکان کو دیکھنے کی طرف متوجہ کر رہے ہیں۔؟

ویسے دادا جان۔۔میں نے لوگوں کا ایک معمول غور سے دیکھا ہے۔۔۔اسے محسوس کیا ہے۔۔۔جوں ہی رمضان شروع ہوتا ہے ۔۔۔مساجد بھر جاتی ہیں،تراویح کے وقت تو عجیب رونق دیکھنے میں آتی ہے۔۔۔۔شروع کے آٹھ دس دن تمام مسجدوں میں رونق دیکھنے میں آتی ہے ۔۔دوسرا عشرہ شروع ہوتا ہے تو نمازیوں کی تعداد کم ہونے لگتی ہے۔۔۔تراویح کے وقت رونق نصف رہ جاتی ہے۔۔۔اور بازاروں میں رونق بڑھ جاتی ہے۔۔۔۔تیسرے عشرے میں تو حد ہی ہو جاتی ہے۔۔۔مساجد میں نمازی عام دنوں سے کم ہو جاتے ہیں اور بازاروں میں بے تحاشا رش شروع ہو جاتا ہے۔۔جب کہ آپ دیکھ رہے ہیں ۔۔یہ آخری عشرہ ہے۔۔۔رمضان المبارک رخصت ہونے کے قریب ہے،لیکن مساجد میں رونق ختم ہو گئی ہے اور بازاروں کی رونق کئی گنا بڑھ گئی ہے۔۔ایسا کیوں دادا جان ۔۔!صرف ایک دکان دار اتنے بڑے بازار میں ایسا کیوں ہے۔؟جو ان دنوں میں بھی جب کہ رش بے تحاشا ہے۔۔دُکان چھوڑ چھاڑ کر مسجد کی طرف چلا جاتا ہے۔۔

"ہاں بیٹے!یہی تو میں تم سے کہہ رہا ہوں۔۔۔اسی لیے تو میں نے تم سے پوچھا تھا کہ توقیر۔۔!تم اِس دُکان کو دیکھ رہے ہو۔۔؟چلو شکر ہے۔۔۔تم نہ صرف یہ کہ دیکھ رہے ہو بل کہ تم تو مجھے بھی دیکھا رہے ہو۔واقعی توقیر تمھارا مشاہدہ بہت تیز ہے۔جن لوگوں کا مشاہدہ تیز ہوتا ہے نا۔۔۔اُنھیں زندگی میں آسانی رہتی ہے۔"

"آپ نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ میری توجہ اِس دُکان کی طرف کیوں دلا رہے تھے۔؟"

"آؤ، پہلے ذرا دُکان کے مالک سے علیک سلیک کر لیں۔۔مجھے اِس سے سلام دعا کرنا بہت پسند ہے۔۔ویسے اِس شخص کا مجھ پر بہت بڑا احسان ہے۔"

"احسان!!میں سمجھا نہیں دادا جان!"

"پہلے ملاقات کر لیں پھر گھر کا رُخ کرتے ہوئے بتاؤں گا کہ میں تمھاری توجہ اِس دُکان کی طرف کیوں دلا رہا تھا۔"

اب توقیر کے دادا اس کا ہاتھ تھامے دُکان میں داخل ہوئے۔۔ دُکان میں اگرچہ گاہکوں کا ہجوم تھا،لیکن اُس کے باوجود دُکان دار نے اُنھیں اندر داخل ہوتے دیکھ کر فوراہی کہہ دیا۔

"آیئے آیئے صاحب جی! آیئے۔۔!

ارے، یہ تو اپنے شیخ احمد صاحب ہیں ۔۔۔" یہ کہتے ہی وہ گرم جوشی سے اُن کی طرف بڑھا، پھر خلوص سے دونوں سے ہاتھ ملایا پھر بولا:

"مجھے افسوس ہے۔۔۔!میں اِس وقت آپ کو بیٹھنے کے لیے کچھ پیش نہیں کر سکتا۔۔۔آپ دیکھ ہی رہے ہیں ماشاءاللہ دُکان میں کتنا رش ہے۔"

"آپ اپنے گاہکوں کی طرف توجہ دیجیے۔۔میں تو ایسے ہی اپنے پوتے کو آپ سے ملوانے کے لیے لے آیا ہوں۔۔۔

"بہت بہت شکریہ۔۔!اگر آپ اِنھیں افطاری بعد لے آئیں تو اکیلے بیٹھ کر چائے پی لیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔۔ہم کوشش کریں گے۔۔۔وعدہ نہیں کرتے۔۔

"توقیر کے دادا فوراً بولے۔

"جی شیخ صاحب۔۔۔!ٹھیک ہے۔"

اور پھر دونوں ان سے ہاتھ ملا کر باہر آ گئے۔۔اس وقت دادا جان (بقیہ نمبر 48 پر)

فیصلہ

تحریر: اشتیاق احمد

انتخاب: عبدالصمد مظفر، لاہور

معروف ادیب عبدالصمد مظفر کا اشتیاق احمد کے بارے میں کہنا ہے۔ اشتیاق احمد ایک ایسا نام ہے جس نے اپنی تحریروں سے نا صرف نئی نسل بلکہ بڑوں کی زندگی کو اللہ کریم کے فرمان میں ڈھال دیا ہے۔ میری اُن سے متعدد بار ملاقات ہوئی اور ہر بار اپنائیت اور شفقت کا احساس ملا۔ اشتیاق احمد جیسے قلم کار کئی صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اللہ کریم اُن کے قلمی صدقہ جاریہ کو اُن کے درجات کی بلندی کا وسیلہ بنادے۔ آمین۔ ایک ایسی کہانی جو میں نے کئی بار پڑھی اور کئی بچوں کو پڑھ کر سنائی آپ سب کی نذر ہے۔

ایک مرتبہ دو آدمی قاضی ایاس بن معاویہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنا معاملہ پیش کیا، دونوں ایک چادر کے بارے میں لڑ رہے تھے اور دونوں میں سے ہر ایک کا یہ کہنا تھا کہ "یہ چادر میری ہے۔"

قاضی صاحب نے دونوں سے کہا: "باری باری اپنا معاملہ میرے سامنے پیش کرو۔"

پہلا شخص کہنے لگا: "قاضی صاحب! میں غسل کے ارادے سے نہر کی طرف گیا، میں نے اپنی قیمتی چادر نہر کے کنارے رکھی اور خود نہر میں نہانے لگا، اسی دوران یہ آدمی بھی آگیا اور اپنی چادر میری چادر کے پاس رکھ کر یہ بھی نہانے لگا، لیکن یہ مجھ سے پہلے نہر سے نکلا اور اپنی چادر کی بجائے میری چادر اُٹھا کر چلتا بنا اور اب یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ یہ (میری) چادر اس کی ہے۔"

اب قاضی صاحب نے دوسرے آدمی سے کہا:

"تم اپنا معاملہ پیش کرو۔"

دوسرے آدمی نے بھی بالکل یہی قصہ سنایا۔

قاضی صاحب نے دونوں سے گواہوں کا مطالبہ کیا، لیکن دونوں کے پاس گواہ نہ تھے، آخر قاضی صاحب نے حکم دیا: "ایک کنگھی لے آؤ!" جب کنگھی لائی گئی تو قاضی صاحب نے دونوں کے سر میں پھروا کر دیکھ، ان میں سے ایک شخص کے سر سے اس قیمتی چادر کے کچھ ذرات اور دھاگے وغیرہ نکلے، کیوں کہ وہی اس کا مالک تھا اور اکثر اس چادر کو استعمال کرتا رہتا تھا، جب کہ دوسرے شخص کے سر سے دوسری چادر کے دھاگے وغیرہ نکلے۔

قاضی صاحب نے فیصلہ کیا: "قیمتی چادر کا اصل مالک وہی شخص ہے جو پہلے نہانے کے لیے نہر میں داخل ہوا تھا، جب کہ دوسرے کو جھوٹ بولنے کی سزا میں گرفتار کیا جائے۔

فائدہ: عزیز بچو! یہ بہت بُری بات ہے کہ اپنے ساتھ کی کوئی چیز اچھی لگی، یا اسکول میں کوئی چیز پسند آگئی یا بازار گئے تو وہاں کی چیزیں دل کو بھا گئیں اور ہم پوچھے بغیر، بتائے بغیر وہ چیز لے لیں کہ کون ہمیں دیکھ رہا ہے؟؟

حال آں کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ موجود ہے اوت ہر طرف اس کی نگاہ ہے، اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتا دیا ہے کہ اس طرح کا کام کرنا چوری کہلاتا ہے تو جب اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرح چوری کرتے ہوئے دیکھے گا تو ناراض ہوگا۔ اور ہم سے اپنی نعمتیں بھی لے لے گا اور اگر ہم اس کام سے رک گئے تو دنیا میں وہ چیز بعد میں ہمیں نہ ملے، لیکن صبر کرنے اور غلط کام نہ کرنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ جنت میں اس سے بھی اعلیٰ درجے کی چیزیں عطا فرمائے گا۔

"دوستی کا ہیرا"

تحریر۔۔اشتیاق احمد

انتخاب: احتشام الحق، ملتان

انتخاب: جویریہ سیف عبدالحکیم

بچوں کی معروف لکھاری جویریہ سیف کہتی ہیں

یہ اٹل حقیقت ہے جو اس دنیا میں آتا ہے اس نے واپس بھی ضرور جانا ہے۔ "اشتیاق احمد رحلت فرما گئے ہیں"

یہ خبر 17 نومبر 2015 کو سنتے ہیں غم، دکھ، کی اک لہر دل میں سرایت کر گئی۔ آنکھیں اشکبار ہوئیں تو دل سے والہانہ طور پر ان کے لئے مغفرت اور اہل خانہ کے لئے صبر وجمیل کی دعائیں نکلنے لگیں۔ اہل خانہ کے لئے تو بڑا صدمہ تھا ہی۔۔ پورے ملک میں بھی غم کی رات تھی۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ جتنی تکلیفیں انہوں نے دنیا میں سہی ہیں ان سے کہیں زیادہ راحت ملے ان کے بچوں کو ان کے لئے صدقہ جاریہ بنائے ان کے درجات بلند فرمائے اور انھیں نبی آخرالزماں ﷺ کی شفاعت سے بہرہ ور کرے (آمین

اشتیاق احمد کی کہانی "دوستی کا ہیرا" بے حد پسند آئی۔ دلچسپ اور دل پسند کہانیاں تو بے شمار تھیں مگر وقت کی کمی کے باوجود رسائل کی ورق گردانی نہ کر سکی اور نظر آنے والی تین چار کہانیوں میں اچھی کہانی پر بے حد مختصر تبصرہ کرنا پڑا۔

ایک بار پھر دعا ہے اللہ تبارک تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور آخرت میں کامیاب فرمائے۔ آمین۔

وہ اس کوٹھی کے سامنے کھڑا بے تحاشہ رو رہا تھا۔ پاس گزرتے ایک شخص کو یہ بات بہت عجیب لگی، لیکن اس سے بھی عجیب بات اُسے یہ لگی کہ عین اُسی وقت جب وہ وہاں سے گزر رہا تھا، سامنے والے گھر کا دروازہ کھلا تھا اور اس میں سے ایک شخص کرسی اُٹھائے روتے شخص کے پاس آیا تھا۔ اُس نے کرسی اُس کے پاس رکھ دی اور بولا:

"مہربانی فرما کر اس کرسی پر بیٹھ کر رولیں، کھڑے کھڑے کب تک روئیں گے، تھک جائیں گے، اب آپ اتنے بھی جوان نہیں ہیں۔"

"شکریہ میاں احسان صاحب۔" روتے شخص نے کہا اور اس طرح کرسی پر بیٹھ گیا جیسے کرسی کا انتظار ہی کر رہا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس شخص کو اور زیادہ حیرت ہوئی۔ اُس نے ایک نظر روتے شخص کو دیکھا، پھر اُس کے قریب جا کر بولا:

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔"

اس نے ایک نظر اُس شخص کو دیکھا، پھر منہ بنا کر کہنے لگا۔

"میں اپنے رونے کی وجہ جانتا ہوں، جس کے لیے رو رہا ہوں، وہ بھی جانتا ہے، آپ کو سمجھانے یا بتانے کے لیے نہیں رو رہا۔ جائیں اپنا کام کریں۔"

"جی چلا جاتا ہوں۔۔۔ صرف اتنا بتا دیں، آپ کس لیے رو رہے ہیں۔"

"بھائی پریشان نہ کرو۔۔۔ سامنے سے ہٹ جاؤ۔۔ ورنہ وہ خیال کرے گا۔ آج میں روئے بغیر ہی چلا گیا۔"

"سامنے سے ہٹ جاؤں۔" اس نے حیران ہو کر کہا اور مڑ کر دیکھا۔ وہاں ایک شان دار کوٹھی تھی، اُس کے اوپر کمرے کی ایک

کھڑکی تھی اور اس میں وہ شخص کھڑا تھا۔ یہ دیکھ کر اُس کی حیرت بہت زیادہ بڑھ گئی۔

"آپ ان صاحب کو رو کر دکھا رہے ہیں۔"

"ہاں! اور اب آپ جائیں۔" اس نے جھنجھلا کر کہا۔

ایسے میں وہ شخص وہاں پھر آ گیا۔ جو کرسی اُٹھا کر لایا تھا۔ اُس نے اس شخص کا ہاتھ پکڑا اور اس طرف لے جانے لگا، جس طرف سے کرسی لایا تھا۔

"کیا بات ہے۔ آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں۔" "یہ ساتھ ہی میرا گھر ہے۔ اس کے ڈرائنگ روم میں۔" اُس نے مسکرا کر کہا۔

لیکن کیوں۔؟

"آپ یہ جاننا چاہتے ہیں نا کہ یہ صاحب کیوں رو رہے ہیں اور وہ جو سامنے والی کوٹھی کی کھڑکی میں کھڑے ہیں۔۔۔ وہ وہاں کیوں کھڑے ہیں۔۔۔ یہ صاحب اپنا رونا انھیں کیوں دکھانا چاہتے ہیں۔"

"ہاں! اس لیے کہ مارے حیرت کے میرا بُرا حال ہے۔۔۔ میں واقعی یہ بات جاننا چاہتا ہوں۔۔۔ اگرچہ میں ایک راہ گیر ہوں۔۔۔ اس طرف سے گزر رہا تھا کہ اُنھیں روتے دیکھ کر رُک گیا۔

"بالکل ٹھیک۔۔۔ آپ تشریف رکھیں۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا ہے۔ یہاں سے یہ دونوں نظر آ رہے ہیں۔ پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔ اگرچہ اِس کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میرا نام میاں احسان ہے۔۔۔ جو صاحب کرسی پر بیٹھے رو رہے ہیں۔ ان کا نام ہے محمد عبداللہ اور جو صاحب اپنی کوٹھی کی کھڑکی میں کھڑے ہنس رہے ہیں وہ ہیں تنویر خان۔ اب سُنیں مسئلہ کیا ہے۔

آج سے ایک سال پہلے تنویر خان اور محمد عبداللہ دونوں گہرے دوست تھے۔ ان کی دوستی بہت پرانی تھی۔ ایک سال پہلے تنویر خان نے فون کر کے محمد عبداللہ کو اپنی کوٹھی پر بلایا اور بلایا بھی رات کے وقت۔ فون پر اُنھوں نے بتایا تھا کہ آج ہی ایک بہت خوبصورت اور قیمتی ہیرا خریدا ہے۔ وہ میں آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔۔۔ تنویر خان کا فون سُنتے ہی محمد عبداللہ گھر سے نکل کھڑا ہوا اور یہاں۔۔۔ یعنی اِس کوٹھی میں پہنچ گیا۔ تنویر خان اُس سے گرم جوشی سے ملا اور اسے کوٹھی کے اوپر والے کمرے میں لے آیا۔ تنویر خان کو ہیرے اور دوسری قیمتی چیزیں جمع کرنے کا بہت شوق ہے۔ اور اب جب بھی کوئی ایسی چیز خریدتا ہے۔۔۔ اپنے دوست کو دِکھانے کے لیے ضرور بلاتا ہے۔

تنویر خان نے تجوری کھولی اور اُس میں سے ہیرا نکال کر محمد عبداللہ کے سامنے رکھ دیا۔ کافی دیر تک محمد عبداللہ اس ہیرے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا رہا۔ آخر اُس نے کہا۔

اِس میں شک نہیں۔۔۔ ہیرا بہت زبردست ہے۔

"بس اسی لیے تمھیں بُلایا تھا۔۔۔ کہ تم بھی دیکھ لو۔"

"شکریہ دوست"

کافی دیر تک محمد عبداللہ ہیرے کو الٹ پلٹ کر دیکھتا رہا۔ اور دونوں دوست ایک دوسرے سے گپ شپ لگاتے رہے۔ آخر محمد عبداللہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اجازت چاہی۔ تنویر نے کہا۔

"چلو میں تمھیں نیچے تک چھوڑ آتا ہوں۔ پہلے میں ہیرا تجوری میں رکھ دوں۔" محمد عبداللہ نے سر ہلا دیا۔ پھر یہ دونوں نیچے آئے اور محمد عبداللہ تنویر خان سے رخصت ہوئے۔ یہ اپنی گاڑی پر آئے تھے۔۔۔ یہ بھی کھاتے پیتے ہیں۔ اب ہوا یہ۔۔۔ دو تین دن بعد

تنویر خان نے تجوری کھولی اور ہیرا دیکھنے کے لیے دراز میں ہاتھ ڈالا تو ہیرا اُس میں نہیں تھا۔ وہ دھک سے رہ گیا۔ ہیرے کے بارے میں صرف اور صرف محمد عبداللہ کو پتا تھا یا پھر ان کے گھر کے افراد کو۔۔ گھر کے افراد میں کسی کو یہ ضرورت نہیں تھی کہ ہیرا چُراتا۔۔ تنویر خان اپنے گھر والوں کے لیے ہیرا آدمی ہیں۔ گھر کی چابیاں سب گھر والوں کے لیے ایک جگہ ہوتی ہیں۔ ان میں سے کسی پر بھی شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔۔ یہ میں نہیں کہتا، خود تنویر خان اور آس پاس کے سب لوگ جانتے ہیں۔ اب لے دے کر اُنھیں یہی خیال آ سکتا تھا کہ ہیرا محمد عبداللہ نے چرایا ہے۔ اُنھیں بہت غصہ آیا۔ فوراً عبداللہ کو فون کیا۔ اور اُنھیں کھری کھری سُنا دی کہ ہیرا فوراً واپس کرے۔۔۔ نہیں تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ محمد عبداللہ دوڑتا آیا۔ اب اُنھوں نے لاکھ کہا کہ اُنھوں نے ہرگز ہیرا نہیں چرایا۔۔۔ لیکن تنویر خان نے ان کی بات ماننے سے انکار کر دیا اور یہی کہتے رہے کہ ہیرا تمھارے علاوہ اور کوئی تو چرا ہی نہیں سکتا، انھوں نے یہ بھی کہا کہ تمھیں یہ تک معلوم ہے کہ ہم چابیاں کہاں رکھتے ہیں۔ لہٰذا تم کسی وقت آئے اور چابیاں وہاں سے اُٹھا کر سیف کھولی اور ہیرا لے گئے۔ تمھارے گھر میں آنے جانے پر پابندی تو تھی ہی نہیں ۔۔ میری عدم موجودگی میں بھی تم اکثر آ جاتے ہو۔۔۔ لہٰذا تم ہی چور ہو۔

اِدھر محمد عبداللہ نے اس بات سے صاف انکار کر دیا۔ یہ خود کو چور ماننے پر کسی طرح تیار نہ تھے۔ اب تنویر خان کے لیے یہ سوال تھا کہ وہ کیا کریں۔ اگر پولیس اسٹیشن جا کر ہیرے کی گم شدگی کی رپورٹ درج کراتے ہیں تو پولیس فوراً محمد عبداللہ کو گرفتار کرے گی اور ان سے اگلوانے کے تمام حربے اختیار کرے گی۔ جب کہ یہ بات تنویر خان کو پسند نہیں تھی۔۔ اس طرح تقریباً ایک ماہ تک یہ جھگڑا چلتا رہا۔۔۔ آخر تھک ہار کر تنویر خان نے اپنا فیصلہ سُنایا۔۔۔

"محمد عبداللہ تم نہیں مانتے تو نہ مانو۔۔۔ لیکن میں جانتا ہوں، چور تم ہی ہو لیکن پھر بھی یہ معاملہ پولیس تک نہیں لے جاؤں گا۔ میں تمھیں گرفتار نہیں کراؤں گا۔ لیکن آج سے تم میرے دوست نہیں ہو۔ جاؤ۔۔۔ چلے جاؤ۔۔۔ اور اب کبھی مجھے نظر نہ آنا۔۔۔ اس کی بات کے جواب میں محمد عبداللہ نے کہا۔"

"اور تم میری بھی سُن لو۔۔ آج گیارہ تاریخ ہے۔ میں ہر ماہ کی گیارہ تاریخ کو یہاں۔۔۔ تمھاری کوٹھی کے سامنے آ کر رویا کروں گا۔۔۔ اس دوستی کی یاد میں جسے تم نے ایک ہیرے سے بھی کم قیمت سمجھا۔ شاید تمھیں مجھ پر یقین آ جائے۔۔۔ اُس روز سے محمد عبداللہ ہر ماہ کی گیارہ تاریخ کو یہاں آ کر روتا ہے، اُس دوستی کی یاد میں جو ایک ہیرے کی چکاچوند میں گم ہو گئی۔۔۔ یہ ہے کل کی کہانی۔۔۔

"اوہ۔۔۔ اوہ!" مارے حیرت، افسوس اور دکھ کے راہ گیر کے منہ سے نکلا۔

میاں احسان نے دوسرے دن صبح سویرے اپنے گھر کا دروازہ کھولا تو اس کے ایک پڑوسی نے ایک پیکٹ اُسے دیا۔ وہ پیکٹ پا کر حیران بھی ہوا اور خوف زدہ بھی۔ پھر ڈرتے ڈرتے اُس نے پیکٹ کو کھولا تو اُس میں سے ایک ہیرا نکلا اور چند الفاظ پر مشتمل یہ خط بھی۔۔۔

"تنویر خان کا ہیرا دراصل میں نے چرایا تھا۔ اتفاق سے یہ اسی رات ہوا جس رات اُس نے اپنا ہیرا محمد عبداللہ کو دکھایا تھا، میں

وہیں ان کی چھت پر چھپا ہوا تھا۔۔میں ایک ماہر چور ہوں اور یہ ہیرا چرانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ثابت ہوا تھا۔۔لیکن محمد عبداللہ کے آنسو مجھے اس ہیرے سے زیادہ قیمتی لگے۔۔۔سو آپ یہ تنویر خان کو دے دیں۔۔۔۔شکریہ۔"

میاں احسان ہکا بکا تنویر خان کے پاس پہنچ گیا۔اور ہیرا اسے دے دیا۔وہ خط بھی اُسے دے دیا۔وہ سکتے میں آ گیا۔اُسی وقت اُٹھا، کار میں بیٹھا اور محمد عبداللہ کی طرف دوڑ پڑا۔۔۔آج اُس کا دل بُری طرح رو رہا تھا۔اسے محمد عبداللہ کے آنسو یاد آ رہے تھے۔محمد عبداللہ اسے صبح سویرے اپنے دروازے پر دیکھ کر دھک سے رہ گیا۔اور جب تنویر خان نے ہیرا اور وہ خط اُس کے سامنے رکھا تو وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے تنویر خان کو دیکھتا رہ گیا۔ادھر تنویر خان نے کہا۔۔۔

"مجھے معاف کر دینا دوست۔۔۔میں نے تمہیں غلط سمجھا۔آج سے تم میرے اُسی طرح دوست ہو۔۔۔جیسے پہلے تھے۔۔۔" یہ کہہ کر تنویر خان نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے۔لیکن محمد عبداللہ ٹس سے مس تک نہ ہوا، بلکہ اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے۔

"لیکن تنویر خان صاحب! تم نے اس ہیرے کے ملنے پر مجھے بے گناہ سمجھا۔۔۔میرے آنسوؤں پر تم نے اعتبار نہیں کیا، اگرچہ میں نے یہ گیارہ مہینے تک بہائے ہیں۔لہٰذا اب مجھے تمھاری دوستی نہیں چاہیے۔۔۔۔تم اب اس ہیرے سے دوستی لگا لو۔۔۔"

اتنا کہتے ہی محمد عبداللہ نے دروازہ بند کر لیا اور چٹخنی لگا لی۔

"خالی پرس"

تحریر۔ اشتیاق احمد

انتخاب: مجید احمد جائی

مجید احمد جائی (ایڈیٹر کرن کرن روشنی ڈائجسٹ) اشتیاق احمد کے بارے میں کہتے ہیں۔

محترم اشتیاق احمد، بہت بڑا نام ہے جنہوں نے بچوں کے لئے جاسوسی ادب تخلیق کیا۔بچوں کے ادب پہ کام کیا، کاش کے سرکاری سطح پر یہ کام کیا جاتا۔اشتیاق احمد صاحب واقعی کمال لکھتے تھے۔ان کی تحریریں سادگی کا اعلیٰ نمونہ ہوتیں تھیں۔ابھی "خالی پرس" ہی کو دیکھ لیجئے۔خوش اسلوبی کے ساتھ اپنی بات کہہ گئے اور عقل والوں کے لئے بہت کچھ تحریر کر گئے۔یہ دُنیا فانی ہے ہر کسی نے چلے جانا ہے لیکن اشتیاق احمد کا یوں چلے جانا، بچوں کے ادب کو یتیم کر گیا ہے۔اللہ تعالیٰ کو جوار رحمت میں جگہ عنایت فرمائے آمین

"پلیٹ فارم پر اُنہیں انسپکٹر ساجد کہیں بھی دکھائی نہیں دیا۔"

"کیا آپ نے انکل ساجد کو اطلاع نہیں دی" محمود نے کہا۔

"نہیں۔وہ بولے۔"

"کیوں؟"

"ہم اُس کے ہاں نہیں ٹھہریں گے۔"

"وہ کیوں۔" فرزانہ نے پوچھا۔

"اگر اُس کے ہاں ٹھہرے تو جیب کتروں کو نہیں پکڑ سکیں گے۔

"تو پھر"

"ہم ہوٹل مون لائٹ میں ٹھہریں گے۔سُنا ہے کہ وہ یہاں کا

سب سے اچھا ہوٹل ہے۔"

"تو چلئے پھر۔۔" ایک قلی نے اُن کا سامان اٹھایا۔وہ اسٹیشن سے باہر آنے لگا۔ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر ہوٹل کی طرف روانہ ہو گئے۔

انسپکٹر جمشید ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے تھے اور وہ چاروں پچھلی سیٹ پر تھے۔ٹیکسی تیز رفتاری سے چلی جا رہی تھی کہ اچانک ڈرائیور نے ایک موڑ کاٹا۔وہ سنبھل نہ سکے۔ایک طرف کو جھکتے چلے گئے انسپکٹر جمشید بھی چونکہ بے خبر تھے اس لئے ڈرائیور پر لڑ پڑے۔موڑ کاٹنے کے بعد جب ٹیکسی سیدھی دوڑنے لگی تو انسپکٹر جمشید نے محسوس کیا۔ان کی جیب ہلکی ہو چکی ہے۔وہ حیران رہ گئے۔یہ انسپکٹر جمشید تھے جنہوں نے جیب کے ہلکے پن کو محسوس کر لیا۔کوئی اور ہوتا تو اُس کے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہوتی۔انہوں نے پرسکون آواز میں کہا۔"ڈرائیور صاحب! ذرا گاڑی روکنا۔"

"شاید ہمیں اسٹیشن واپس جانا پڑے۔تم گاڑی روک لو۔میں ایک منٹ کے لیے سوچنا چاہتا ہوں۔شاید ہم ایک اٹیچی کیس پلیٹ فارم پر ہی بھول آئے ہیں۔"

"اوہ" ڈرائیور کے منہ سے نکلا اور اُس نے ٹیکسی کو بریک لگائی۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" محمود نے حیران ہو کر کہا کیونکہ وہ گھر سے ایک ہی سوٹ کیس لے کر چلے تھے۔عین اُسی وقت فرزانہ نے اُس کے پیر پر پیر رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔وہ سمجھ گئی تھی کہ ضرور کوئی بات ہے، جس کی وجہ سے اُن کے والد ٹیکسی رکوا رہے ہیں۔اب وہ اتنے بھلکڑ بھی نہیں تھے کہ اُنہیں یہ بھی یاد نہ رہتا کہ گھر سے کیا کچھ لے کر چلے تھے۔

ٹیکسی رُکتے ہی انسپکٹر جمشید نے جیب سے پستول نکال لیا اور ڈرائیور کے سینے پر رکھتے ہوئے بولے۔"میرا بٹوہ نکالو۔"

"کیا" اُن کے منہ سے حیرت کی زیادتی سے نکلا۔ڈرائیور بھی ہکا بکا رہ گیا۔اُس سے کوئی بات بن نہ پڑی۔ساکت و جامد بیٹھا رہ گیا۔

"تم نے پرس نہیں نکالا۔" انسپکٹر جمشید غرائے۔

ڈرائیور نے پتلون کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ان کا بٹوہ نکال کر ان کی طرف بڑھا دیا۔اُنہوں نے بٹوہ لیا، اپنی جیب میں رکھ کر مسکرائے۔ "ٹیکسی تمھاری اپنی ہے۔"

"ہاں۔" ڈرائیور نے اکھڑ لہجے میں کہا۔

"محمود! ٹیکسی کے نمبر نوٹ کرو۔" اُنہوں نے محمود سے کہا۔

"جی بہتر۔" محمود نے کہا اور نمبر نوٹ کرنے کے لئے نیچے اُتر گیا۔

"لائسنس دکھاؤ۔" انسپکٹر جمشید بولے۔اُس نے لائسنس نکال کر ان کو تھما دیا۔ "محمود! اس کا نام بھی نوٹ کرو۔۔۔عرفان۔۔"

"جی۔۔۔کر لیا۔"

"ٹھیک ہے۔اب تم مون لائٹ چلو اور یہ بات یاد رکھو کہ یہ پستول میری جیب میں ہوتے ہوئے بھی تمھاری طرف اُٹھا رہے گا۔اگر تم نے کوئی غلط حرکت کرنے کی کوشش کی تو خود ذمے دار ہو گے۔"

ٹیکسی ایک بار پھر چل پڑی۔پھر وہ مون لائٹ ہوٹل کے سامنے اُترے۔انسپکٹر جمشید نے ٹیکسی کا بل ادا کیا اور ڈرائیور سے مسکرا کر بولے۔ "اب تم جا سکتے ہو۔"

وہ چند لمحے حیران حیران نگاہوں سے اُنہیں گھورتا رہا پھر ٹیکسی ایک جھٹکے سے آگے بڑھ گئی۔وہ ہوٹل کے دروازے کی طرف بڑھے تو اُن کی نظریں ایک بورڈ پر پڑیں۔اس پر موٹے موٹے سفید حروف میں لکھا تھا۔

خبردار! اس ہوٹل میں آنے سے پہلے اپنی جیب ٹٹول لیں۔ اگر کھانا کھانے کے بعد بل ادا نہ کر سکے تو بل آپ کے کوٹ یا رسٹ واچ کی صورت میں وصول کر لیا جائے گا۔ اس شہر میں اچکوں کی حکومت ہے۔ کسی کی جیب محفوظ نہیں۔ جیب کٹ جانے کی صورت میں ہوٹل ذمہ دار نہیں ہوگا۔

وہ اس بورڈ کو پڑھ کر حیران بھی ہوئے اور ہنسے بھی۔ کاؤنٹر پر پہنچ کر انسپکٹر جمشید نے کہا۔

''ہمیں ایک ڈبل روم چاہیے۔''

''جی۔ ڈبل روم تو مل جائے گا۔ کیا آپ اپنی جیب کا جائزہ لے چکے ہیں۔'' کاؤنٹر پر کھڑے آدمی نے کہا۔

''تم فکر نہ کرو۔۔ میرا بٹوہ محفوظ ہے۔''

''تعجب ہے۔ آپ بٹوہ کیسے بچا لائے۔'' کاؤنٹر مین نے حیران ہو کر کہا۔ ''بس۔ اسے اتفاق کہہ لیں۔''

''اچھا ٹھیک ہے۔ اس رجسٹر میں اپنا نام۔ پتا درج کر دیں۔ اور تین دن کا ایڈوانس کرایہ ادا کر دیں۔''

اُنہوں نے ایسا ہی کیا۔ ایک بیرے نے اُن کا سامان اُٹھایا اور ان کے کمرے تک رہنمائی کی۔ کمرہ بہت خوبصورت اور بہترین قسم کے فرنیچر سے آراستہ تھا۔ وہ اُسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ۔ جب ضرورت ہو گی، بلا لیں گے۔'' انسپکٹر جمشید بیرے سے بولے۔

''او کے سر! بیرا چلا گیا۔''

''محمود! دروازہ اندر سے بند کر لو۔'' انہوں نے بیرے کے جاتے ہی کہا۔

''کیوں ابا جان! کیا جیب کترے کمرے سے باہر کھڑے بھی جیب کاٹ سکتے ہیں۔'' فاروق نے حیران ہو کر کہا۔

''نہیں، یہ بات نہیں۔'' انسپکٹر جمشید ہنسے۔ دراصل میں تم تینوں کو کچھ ہدایات دینا چاہتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کوئی جیب کترا دروازے کے پاس کھڑا ہو کر سُن لے۔

محمود دروازہ بند کر چکا تو وہ بولے۔ ''تمھارے بٹوؤں میں جتنے پیسے ہیں۔ اُنہیں نکال کر سوٹ کیس میں رکھ دو۔ بس چند روپے رہنے دو۔ یہ اچکے تو ضرورت سے زیادہ ہی تیز ہیں۔

''ابا جان! یہ تو ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔''

''بہت خوب۔! اب تم بٹوؤں کی حفاظت نہ کرنا۔۔۔ اور بیگم! تمھارے پرس میں تو کوئی نقدی یا زیور وغیرہ نہیں ہے۔؟''

''نقدی تو نہیں ہے۔ کیونکہ آپ دیتے ہی نہیں۔'' وہ مسکرا کر بولیں۔ ''البتہ زیور ضرور ہیں۔

''کیا غضب کرتی ہو۔ کہاں ہے پرس۔؟'' ''یہ رہا۔ میز پر۔''

''اس کھول کر دیکھو۔ کیا زیور اس میں موجود ہے۔؟

''اگر نہ بھی ہوا تو کیا فرق پڑتا ہے۔''

''اس لیے کہ میں گھر سے نقلی زیور لے کر آئی ہوں۔

تینوں اپنی امی کی عقل مندی پر مسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔

''بہت خوب! ویسے تم دیکھو تو سہی۔ کیا زیور موجود ہے۔''

''موجود کیوں نہیں ہوگا۔ پرس تو میرے ہاتھ میں ہی رہا ہے۔''

''اوہو۔۔ دیکھ تو۔۔۔

بیگم جمشید نے اُٹھ کر پرس کھولا۔ دوسرے ہی لمحے وہ حیران رہ گئیں۔ اُن کے منہ سے نکلا۔ ''ارے۔۔۔ یہ تو خالی ہے۔

☆☆☆

آپ بھی اپنا تبصرہ لیے اس ٹرین میں سوار ہو جائیں

روشنی ایکسپریس

☆لاہور سے امان اللہ نیئر شوکت:۔

ایک بار پھر کرن کرن روشنی کے خالق نمبر 2 اظہار خیال کرنے کے لیے ''روشنی ایکسپریس'' ٹرین کے اول درجہ کے ڈبہ میں سوار ہو کر ممتاز آباد پہنچ چکے ہیں۔ ادب کے میدان میں بچوں کے رسائل کے اندر کسی بھی رسالے کو پسند کرنے والے جب لاتعداد رائٹرز اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو اس سے رسالے کی مقبولیت اور معیار کا علم ہوتا ہے۔ ملتان کے اس رسالے ''کرن کرن روشنی'' کے سر پر اپنے ادبی خیالات کا سہرا خوب سجاتے ہیں۔ ''خالق نمبر 1'' کی تحریروں اور ان کے رائٹروں پر جو میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ ان کا رسپانس مجھے جنوری 2016 کے ''کرن کرن روشنی'' سے ملنا چاہیے کہ وہ کیا کہتے ہیں۔ آج کل تو ویسے بھی بچوں کے رسالوں کی قیمتیں 35 اور 40 روپے پر جا پہنچی ہیں۔ جو بچوں کی قوت خرید سے باہر ہے۔ جب رسائل والے کوئی نمبر شائع کرتے ہیں تو اُس کی قیمت اتنی زیادہ رکھ دیتے ہیں جو شاذ و نادر ہی بچے خرید پاتے ہیں۔ بہت ہی کم قیمت والے رسائل بھی بہت کم فروخت ہوتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ ادب کے میدان سے بچوں کی توجہ ہٹ جانا انٹرنیٹ ہے اور موبائل پر گیمز کی توجہ زیادہ بڑھ گئی ہے۔ لیکن بچوں کے رسائل پڑھنے والے اور ادب کے میدان سے شغف رکھنے والے بچے رسائل خریدنے میں دل چسپی لیتے رہتے ہیں۔ علی عمران ممتاز اور حافظ نعیم احمد سیال اپنے اپنے اداریہ میں دل کی بہت سی خوبصورت باتیں کرتے ہیں اور ہم سب کے دل میں اپنے لیے جگہ بناتے ہیں۔ ہر بچوں کے رسالے میں شروعات ''حمد باری تعالیٰ'' اور نعت رسول مقبول ﷺ سے ہونی چاہیے۔ کرن کرن روشنی والے اس بات پر بدستور عمل پیرا ہیں، جو بہت خوشی کی بات ہے۔ محمد اسد اللہ، ناگ پور بھارت سے۔۔ حمد باری تعالیٰ کے ذریعے ہمارے دلوں کو گرما رہے ہیں۔ اتنی دُور سے کرن کرن روشنی کے لیے اپنی محبت نچھاور کر رہے ہیں۔ علی عمران ممتاز بڑے خوش قسمت ہیں۔ اس رسالے کو ناگ پور بھارت میں رہنے والے ادبی بچے پسند کر رہے ہیں۔ علی عمران ممتاز نے بری۔۔ حمد باری تعالیٰ کو ''تولیہ'' میں لپیٹ کر شائع کیا ہے۔ اگر تعلق۔۔۔ اور تولیہ کے درمیان اُلٹی واؤ ڈال دیتے تو کیا مضائقہ تھا۔ ڈاکٹر محمد افتخار کھوکھر انمول خزانہ۔۔ قرآن کہانی کے ذریعے بھرپور انداز میں بانٹتے پھر رہے ہیں۔ ایسی رومانی تحریریں رسالے کے معیار کو بڑھاتی ہیں۔ ڈاکٹر عمران مشتاق آسٹریلیا سے ''آدھی دعا'' کے ذریعے قارئین کو حیران کر رہے

ہیں۔آدھی دعا سے ہی دادا جان کی معذوری اور محتاجی دُور ہو گئی۔مریم جہانگیر کہہ رہی ہیں ''بات ہے سچائی کی'' نماز میں کاہلی اللہ تبارک وتعالٰی سے ناراضی کا سبب بن جاتی ہے۔نماز تو انسان کو اللہ تبارک وتعالٰی سے قریب تر کرتی ہے۔ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل ''عبدالخالق'' کے ذریعے منے میاں کی کہانی بیان کر رہے ہیں۔جو بہت پسند آئی۔''خالق نمبر 2'' میں رائٹروں نے اچھی کہانیاں سپردِ قلم کی ہیں۔مجید احمد جائی ''میرے اللہ! میں تجھ پہ قربان'' ہونے جا رہے ہیں۔صحت عطا کرنا رب رحمان کا کام ہے۔خالق کی نماز کو معمول بنالینا چاہیے۔اُس کے ذریعے عافیت اور رحمتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔علی عمران ممتاز تعریفی قرآنی کلمات کے ترجمہ کے ذریعے رسالے کی پٹیوں میں بچوں کو اچھا سبق پڑھا رہے ہیں۔''اے زندہ اور ہمیشہ قائم رہنے والے ہم تیری رحمت کے طالب گار ہیں۔۔۔''محمد شاہد فاروق کی پشیمانی کا جھٹکا'' نے مجھے بھی جھٹکا لگا دیا ہے۔جائیداد کا لالچ گھر بھی برباد کرتا ہے اور ازدواجی زندگی کا سکون بھی غارت ہوتا ہے۔شکیل جان داجل ''سکون قلب'' کی خاطر خوبصورت کہانی قلم بند کر رہے ہیں۔فیصل ابراہیم ''ایسا بھی ہوتا ہے'' میں تایا جان کے بچوں کو قرآن مجید فرقان حمید کی تعلیم کے ذریعے عالم دین بنا رہے ہیں۔''خالق نمبر 2 میں دل کو گرمانے اور فکر انگیز تحریریں شائع ہوئی ہیں۔بچوں نے تحریروں کے ذریعے بے بہا ادبی خزانے لٹائے ہیں۔اریبہ بلوچ ''خالق کُل کائنات'' کا تعارف کرانے میں پیش پیش ہیں۔انسان کو بدنصیب شیطان بناتا ہے۔وہ اس کے مکروفریب بھی آجاتا ہے۔اللہ تبارک وتعالٰی تو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے۔گناہ معاف کرنے کے لیے اس کا توبہ کا دروازہ آج بھی کھلا ہے۔بس نماز کے ذریعے اللہ تبارک وتعالٰی سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔محمد نادر کھوکھر کہہ رہے ہیں۔''شکر اس کا'' یعنی اللہ تبارک وتعالٰی کا جس نے ہمارے احساس، پیاز اور اخلاق کو پیدا کیا اور ہم اُس کے ذریعے رکشے والے کے اندر نیکی کرنے کا احساس پیدا کر رہے ہیں۔رائٹرز اپنی تحریروں میں واقعی جان ڈال دیتے ہیں۔سبق حاصل کرنا بھی تو بہت ضروری ہے۔اس طرف بھی ہمیں آنا چاہیے۔حافظ نعیم سیال بڑی فکر انگیز تحریریں سپردِ قلم کرتے ہیں اور وہ بھی کرن کرن روشنی میں، ''بچوں کا پرستان'' کو اُنہوں نے نظر انداز کیا ہوا ہے۔اس بار بچوں کا پرستان پر تبصرہ کر کے کہانی سے ٹرخا دیا ہے۔حافظ نعیم احمد سیال لا رہے ہیں ''تیری یاد میں الٰہی'۔اللہ تبارک وتعالٰی کی یاد میں مست ہو کر حمد وثنا کے ذریعے خوب گنگنا رہے ہیں۔اشوارانا کا ''خبر ہونے تک'' میں تحریر کو خوبصورت انداز میں آگے بڑھانے کا وطیرہ خوب ہے۔پتہ نہیں اشوارانا کو بچوں کا پرستان کیوں نظر نہیں آتا۔ڈاکٹر محمد عبیداللہ، ڈاکٹر ہونے کے باوجود خاموش طبع رائٹر ہیں۔بات کرنے سے پہلے اپنے دونوں لبوں کو سوئی دھاگے سے سی لیتے ہیں لیکن اپنی تحریر۔۔۔''یہ ممکن ہی نہیں'' میں کہہ رہے ہیں کہ دُعا کرنے کے لیے لبوں کو وا کرنا ہی پڑتا ہے۔بڑے خاموش طبع رائٹر ہونے کے باوجود بہت کچھ کہہ جاتے ہیں جو ہم سُن نہیں پاتے لیکن ان کی تحریروں سے پتہ چل جاتا ہے کہ وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔صداقت حسین ساجد ادب کے میدان میں پھر سے زندہ ہو گئے ہیں۔وہ تو ادب کے میدان میں قلم چھوڑ کر زندہ درگور ہو چکے تھے۔اب اگر گور سے باہر نکل ہی آئے ہیں تو اپنے اطراف میں نگاہ دوڑائیں کہ

کہیں۔۔۔۔امان اللہ نیرّ شوکت اور بچوں کا پرستان انہیں نظر آرہے ہیں یا نہیں۔علی عمران ممتاز، صداقت حسین ساجد کا موبائل نمبر sms کردیں تو ان کا نیرّ پر بہت احسان ہوگا۔وہ اپنی طویل تحریر ''یہ سچ ہے'' میں اپنی قلم کے ذریعے فکر انگیز جو ہر دکھا رہے ہیں۔بڑے خوش قسمت ہیں علی عمران ممتاز جی، کو اپنے کرن کرن روشی کے لیے بلند پایہ ادیب ملے ہوئے ہیں۔اسد علی انصاری بچوں کا پرستان کے لیے خوبصورت مافوق الفطرت تحریر بھجوانے کا شکریہ۔''خالق نمبر 2'' کو سنوارنے اور نکھارنے کا سہرا اس کا ہارڈ ورکنگ ٹیم پر بجتا ہے۔خوب محنت کی گئی ہے۔پروف خوانی کی غلطیاں خال خال نظر آتی ہیں۔''خالق نمبر'' کی تیاری میں کاشف علی نیرّ نے اپنا کردار خوف ادا کیا۔لیکن ان کی تحریر کہیں نظر نہیں آئی۔اِس کا مجھے بہت افسوس رہے گا۔

خالق نمبر 2 میں شائع ہونے والی تحریروں کے رائٹرز بیدار مغز ہیں۔انہوں نے اپنی تحریروں میں پہناوے کا انداز خوب اپنایا ہے۔علی عمران ممتاز بلاشبہ ادب کے میدان میں ایک درخشاں ستارے کی مانند ہیں۔وہ اپنی تحریر ''کُن'' میں اپنے ننھے ذہن کو بروئے کار لاتے ہوئے اپنے آپ میں بڑاپن پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔اپنی بچپن کی صلاحیتوں سے حیرت انگیز طور پر پردہ اُٹھا رہے ہیں اور اُسی پردے کی اوٹ سے سب رائٹروں کو دینی سبق بھی پڑھا رہے ہیں۔''کُن'' تحریر میں ان کا نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ اپنی سادگی و پُرکاری کو اپنا رہے ہیں۔تحریر بامقصد ہے اور ان کے قلم کی فکر انگیز گردش بچوں کی اخلاقی تربیت کر رہی ہے اور ان کے کردار سازی کے عنصر کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے ہیں۔70% خوابوں کا سچ ثابت ہونا ان کے اعلیٰ دماغ کی غمازی کرتا ہے۔اپنی زندگی میں سچ کو حقیقت کا پہناوا پہنانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔تحریر ''کُن'' اپنے اندر دلچسپی، سادگی، زبان و بیان کی شیرینی اور مقصدیت کے حوالے سے نمایاں مقام رکھتی ہے۔دُنیا سے کنارہ کش ہو کر اپنی آخری آرام گاہ کو روشن دیکھنا اللہ تبارک وتعالٰی سے پیار ومحبت کی گہری نشانی ہے۔سرخی ''کُن'' میں پیش ڈالنا بہت ضروری تھا، تاکہ بچے اس کو ''کُن'' پڑھتے۔پیارے بچوں کو سچ بولنا سیکھنا چاہیے، اسی میں ہماری بھلائی ہے۔اللہ تبارک وتعالٰی جب دُنیا میں کوئی کام کرنا چاہتے ہیں تو ان کی ''کُن'' کہنے کی دیر ہوتی ہے اور وہ کام پلک جھپکتے ہو جاتا ہے۔

☆**سیالکوٹ سے رضیہ خانم** :۔ماہنامہ ستمبر، اکتوبر 2015ء کرن کرن روشنی یادش بخیر! خالق نمبر 2 کی اشاعت بھی ایسا انمول کارنامہ ہے، جس کی مثال نہیں ہے، یہ اپنی ذات میں یکتا ہے اور تعریف وتوصیف کے لئے الفاظ کم ہیں۔محترم علی عمران ممتاز مبارک باد اور لائق تحسین کے مستحق ہیں۔اُن کی شبانہ روز کی محنت ولگن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

اللہ تعالٰی کے ننانوے صفاتی اسم گرامی ہیں۔اب کی بار ہر تحریر اور ہر کہانی میں اللہ تعالٰی کے اِن صفاتی ناموں میں سے کوئی نہ کوئی صفاتی نام بھی ہے جو انسان کی راہنمائی اور اللہ ورسول ﷺ کے احکام کی پیروی کی دعوت دے رہا ہے۔ہر بُرائی سے بچنے کی نصیحت کر رہا ہے۔پنجگانہ نماز ادا کی پیغام دے رہا ہے۔۔۔ بہت خوب۔۔محترم اختر عباس صاحب کی تحریر میں بہت سی باتیں غور طلب ہیں جیسے:

''اے لوگو! اللہ کی نافرمانی سے ڈرتے رہو، روزی کی تلاش میں غلط طریقے مت اختیار کرو۔۔۔ پاکیزہ روزی کھاؤ اور نیک اعمال کرو'' بے شک حلال روزی اور رزق حلال میں برکت ہوتی ہے۔ ''آدھی دُعا'' ڈاکٹر عمران مشتاق، اس تحریر میں اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام یہ ہے کہ اگر دعا خلوص دل سے کی جائے تو اللہ تبارک و تعالیٰ قریب المرگ مریض کو بھی شفاء دینے والا ہے۔ کیونکہ وہ پاک ذات شافی ورحیم ہے۔ ایک جگہ تحریر ہے کہ اللہ تعالیٰ غفار وقہار ہے اور صدقہ و خیرات بہت سی بیماریوں کو ٹال دیتا ہے ۔محترم علی عمران ممتاز کی تحریر ''کُن'' بھی بے مثل ولاجواب ہے ''کُن'' صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ مبارک ذات کہتا ہے ''ہوجا'' تو ہو جاتا ہے۔ یہ طاقت روئے زمین پر کسی ذی روح کے اختیار میں نہیں۔ بہترین تحریر لکھی گئی ہے۔ ''اے خالق'' اے میرے مالک! اس کہانی کا تھیم یعنی مضمون یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ غفور ورحیم ہے۔ انسان ہی اللہ اور رسول پاک ﷺ کے احکام سے غافل ہے۔ ایک جگہ اللہ کی صفات یوں بیان ہیں کہ: ''وہی پاک ذات ہے جو ننھے ننھے ابابیل سے طاقتور ہاتھی ہلاک کرواتا ہے۔ وہی ہے جو چیونٹیوں سے سانپ ہلاک کرواتا ہے اور چڑیوں سے باز مرواتا ہے۔''

قصہ کوتاہ سارا رسالہ اللہ پاک کی پاک صفات کی روشن کرنیں بکھیر رہا ہے۔ یہ سچ ہے، محترم صداقت حسین نے ایک طرح آپ بیتی میں اللہ تعالیٰ کی صفات کا اظہار کیا ہے۔ بہت خوب۔ روشنی ایکسپریس میں محترم امان اللہ نیرّ شوکت کا تبصرہ بہترین و قابل مطالعہ ہے۔ اِس بار قارئین کے خطوط سے ماشاءاللہ! روشنی ایکسپریس واقعی روشن ہے۔ جگمگ کر رہی ہے۔ سبھی خطوط اچھے و معیاری ہیں۔ اب اجازت۔

☆**اڈا بلی والا سے مجید احمد جائی:۔** میری طرف سے سال نو مبارک ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ آپ کو قدم قدم پر کامیاب کرے۔ دینی و دُنیاوی تعلیم سے آراستہ فرمائے اور پاک وطن کی ترقی کے لئے اپنا کردار ادا کرسکیں۔ صحت کی بادشاہی، امن کی زندگی عطا فرمائے، لبوں پر مسکراہٹ، دلوں میں محبت، چہروں پہ تازگی ہو۔ والدین اور بڑوں کا ادب واحترام کرنے والا بنائے۔ نمازی اور پرہیزگار بنائے آمین۔ یقیناً آپ خالق نمبر 1 اور 2 پڑھ چکے ہوں گے۔ میری طرح آپ نے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ علی عمران ممتاز کو میں سلام پیش کرتا ہوں اور ان کے ساتھ ساتھ ان کی پوری ٹیم کو سلام۔ بچوں بلکہ بڑوں کے ادب میں یہ کریڈٹ ان کو جاتا ہے کہ انہوں نے ''خالق نمبر'' پیش کیا۔ میرے ناقص عقل کے مطابق آج کل کسی نے ایسا کارنامہ نہیں کیا۔ مجھے خوشی ہو رہی ہے کہ میں بھی خالق نمبر پارٹ ٹو کا حصہ بنا ہوں اور میری آپ بیتی ''میرے اللہ! میں تجھ پہ قربان'' شائع ہوئی۔ یقیناً آپ سب نے ضرور پڑھی ہوگی۔ یہ شامل سبھی کہانیاں، ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ علی عمران ممتاز کی ''کُن'' سادگی اور شائستہ تحریر کا بہترین نمونہ تھی۔ ٹائٹل بھی شاندار دیا گیا تھا۔ ہاں مگر تھوڑی بہت خامیاں کمپوزنگ میں ضرور دیکھی گئیں۔ اُمید ہے اِس پر قابو پالیا گیا ہوگا۔ ایک چھوٹی سے عرض بھی کروں گا کہ بچوں کے رسالے میں قیمت کا خاص خیال رکھا جائے تاکہ ''کرن کرن روشنی'' ہر بچے کی پہنچ میں ہو۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سبھی کو اپنی حفظ وامان میں رکھے۔ آمین۔

☆**کراچی سے ضیاء الحسن ضیاء:۔** ستمبر، اکتوبر 2015ء کا شمارہ مل گیا۔ ساتھ ہی سہ ماہی ادبی کرنیں بھی نعت شائع فرمانے کا بھی شکریہ، عنایت۔ اللہ کریم آپ اور آپ کی ساری ٹیم کو اپنے حفظ وامان میں رکھے اور عمر دراز عطا فرمائے۔ آمین! آپ کی لگن کی میں داد دیتا ہوں۔ ایک بات آپ کے توسط سے کہنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ کاش اکادمی ادبیات پاکستان بچوں کے سینئر ادیبوں کے مسائل کی طرف بھی توجہ دے۔ بڑے بڑے ہمدرد حضرات آئے اور اپنی مدتِ ملازمت پوری فرما کر چلے گئے، لیکن ان بے چارے ادیبوں کی کبھی خبر نہیں لی، جو ہمدردی کے مستحق ادیب شاعر ہیں اُنھیں بھی وظیفہ دیا جانا چاہیے تھا۔ اکثر اس موضوع پر محترم مسعود صاحب اپنی تعاریر میں ذکر بھی کرتے رہے ہیں۔ اُمید ہے کوئی تو اس طرف بھی توجہ دے گا اور سوچے گا

☆**راولپنڈی سے محمد اسماعیل** (ریٹائرڈ کیپٹن):۔ میں یہ خط محترمہ بیگم ثاقبہ رحیم الدین صاحب کی ہدایت کے مطابق آپ کی خدمت میں تحریر کر رہا ہوں۔ محترمہ بیگم صاحب کی طرف سے سلام دُعا اور نیک خواہشات قبول کیجئے۔ میں بیگم صاحبہ کی کہانی ''تارے نکلنے سے پہلے'' آپ کی خدمت میں بھیجنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مہربانی فرما کر آپ اسے اپنے رسالے کرن کرن روشنی ملتان میں شائع فرما دیں آپ کا شکر گزار ہوں گا۔

سب سے اچھی ہجرت گناہوں سے نیکیوں کی طرف آنا ہے
(مراسلہ: حافظ توحید رانا، ملتان)

''تبدیلی آئی ہے''

تحریر۔۔۔ اشتیاق احمد

انتخاب: سید محمد کلیم شاہ، ملتان

''ہمارے ابا جان بھی عجیب آدمی ہیں'' کبھی کبھی تو ان پر بہت غصہ آتا ہے۔۔۔ بس خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا ہوں۔'' احمد بھنائے لہجے میں اپنے دوست سے کہہ رہا تھا۔

'' آخر ایسی کیا بات ہے۔؟۔۔ کیا کرتے ہیں وہ۔۔ یا کیا کہتے ہیں تم سے۔۔۔'' ارشد نے حیران ہو کر پوچھا'' پہلے تو ایسے نہیں تھے۔۔۔ کچھ ہی مدت میں ان میں یہ تبدیلی آئی ہے۔

پہلے گھر میں کسی کو ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ سب گھر والے ان سے اور وہ گھر والوں سے خوش رہتے تھے۔۔ نہیں اب تو ان کی کسی سے نہیں بنتی۔''

''حیرت ہے، کمال ہے۔۔ آخر وہ تبدیلی کیسی ہے۔۔۔ اب تو میں بھی اس کے بارے میں جاننا چاہتا ہوں۔۔ بہت دلچسپی محسوس کر رہا ہوں۔

''حد ہوگئی۔۔۔ میں جلا بھنا جا رہا ہوں اور یہ دلچسپی محسوس کر رہے ہیں۔۔۔ خبر سنو!''

ایک دن میرے ایک دوست کے گھر سے ایک بڑے برتن میں بریانی آئی۔ بہت زبردست خوشبو تھی اُس کی، سارا گھر مہک گیا۔ میرے دوست دراصل ایک بنک میں مینجر ہیں۔۔ جونہی بریانی کے برتن کا ڈھکنا اُٹھایا گیا، سب اس کو کھانے کے لئے بے چین ہو گئے۔۔ سب نے ایک ایک پلیٹ اُٹھائی اور برتن کے گرد جمع ہو گئے۔۔۔ جب کہ ابا جان اپنی جگہ سے ہلے تک نہیں۔۔

(بقیہ صفحہ نمبر 48 پر)

”حیرت ہے“

تحریر: اشتیاق احمد

انتخاب: ڈاکٹر علی حسنین تابش (چشتیاں)

انسپکٹر ساجد سخت پریشان تھا۔ وہ اس وقت بھی اپنے دفتر میں دونوں ہاتھوں سے سر تھامے بیٹھا تھا۔ اُسے حیرت تھی کہ اب تک انسپکٹر جمشید کیوں نہیں آئے۔ شہر کی حالت وہی تھی۔ لوگوں کی جیبوں پر جیبیں کٹ رہی تھیں اور اس کا ناک میں دم آیا ہوا تھا۔

ابھی ابھی اُسے ایک اور حیرت انگیز اطلاع ملی تھی۔ ایک کانسٹیبل نے بتایا تھا کہ مون لائٹ ہوٹل میں پہلے ایک بلی گھسی اور اس کے پیچھے ایک کتا۔ پھر ہوٹل میں ہڑبونگ مچ گئی اور اس ہڑبونگ میں چھ سات لوگوں کی جیبیں کٹ گئیں۔ وہ جیب کتروں کی دیدہ دلیری پر حیرت زدہ رہ گیا اور مون لائٹ ہوٹل جانے کے لئے اُٹھا ہی تھا کہ اُس کا ماتحت سب انسپکٹر اندر داخل ہوا۔

”کہاں چلے سر!“

”مون لائٹ ہوٹل۔ کیا تم نہیں جانتے کہ وہاں بھرے پرے ہال میں چھ سات آدمیوں کی جیبیں کاٹ لی گئی ہیں۔ انسپکٹر ساجد نے بُرا سا منہ بنا کر کہا۔

”جانتا ہوں سر!“

”تو پھر تم سیدھے وہاں کیوں نہیں پہنچے۔ یہاں کیا لینے آئے ہو۔

”سر! میں اُس وقت ہوٹل سے چند قدم کے فاصلے پر ہی تھا جب یہ واقعہ پیش آیا۔“

”اور پھر۔؟“

”محترم اشتیاق احمد کمال شخصیت کے مالک تھے۔ لیکن افسوس کہ آج وہ ہم میں نہیں رہے اور ہم ان کی تحریروں سے محروم ہو گئے ہیں۔ بچوں کے لئے کمال کام کیا ہے، ان کو بچوں کے ادب کا بانی کہا جاتا ہے۔ انہی کی ایک تحریر مجھے بہت پسند ہے۔ حیرت ہے۔ یقیناً آپ کو پڑھ کر بھی حیرت ضرور ہوگی۔“

”پھر یہ کہ پانچ کانسٹیبلوں کو لے کر ہوٹل میں گھس گیا۔ اس کا بیرونی دروازہ بند کروا دیا اور ہال میں موجود تمام لوگوں کی تلاشی لی۔“

”تو کیا کوئی جیب کترا پکڑا گیا۔“ انسپکٹر ساجد خوش ہو کر بولا۔“

”یہی تو افسوس ہے کہ نہیں پکڑا جا سکا البتہ۔۔۔ ہال میں ایک شخص کی جیب سے بہت پھولا ہوا بٹوہ نکلا تھا۔ اس کے بٹوے میں ساڑھے تیس ہزار روپے کی رقم تھی۔ مجھے اس پر شک ہے۔“

”تو تم اُسے پکڑ کر کیوں نہیں لائے۔“

”میں چاہتا تو یہی تھا مگر وہ شخص بہت چالاک ثابت ہوا۔“

”تو کیا فرار ہو گیا۔“

”جی نہیں۔ بلکہ وہ تو اُسی ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہے، میں اسے پابند کر آیا ہوں اور ہوٹل کے منیجر سے بھی کہہ آیا ہوں کہ اگر وہ ہوٹل چھوڑ کر جانے لگے تو فوراً ہمیں اطلاع دے۔“

”یہ تم نے اچھا کیا۔ چلو میں تمہارے ساتھ چل کر اُسے دیکھتا ہوں، وہ کتنا چالاک ہے۔“

”چلئے“

دونوں اُٹھ کر باہر آئے اور جیپ میں بیٹھ گئے۔ اچانک سب انسپکٹر کا رنگ اُڑ گیا۔

”ایک منٹ ٹھہریئے سر! وہ جیپ سے اُترتا ہوا بولا۔“

”کیا بات ہے۔“ انسپکٹر ساجد نے اُسے بُری طرح گھورا۔ لیکن وہ تو یہ کہتا ہوا دوبارہ کمرے میں گھس گیا تھا۔

”ابھی آیا سر!“

پھر وہ واپس آیا تو اُس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔

”آخر تمہیں کیا ہوا۔ اتنے گھبرا کیوں گئے ایک دم۔ انسپکٹر بھی حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔“

”اب یہ ثابت ہو جاتی ہے۔ سب انسپکٹر بڑبڑایا۔ جیپ میں بیٹھ کر اسٹیرنگ سنبھال چکا تھا۔“

”کون سی بات ثابت ہو جاتی ہے۔“ انسپکٹر ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔“ ”وہ ضرور جیب کتروں کا سردار ہے۔“

”کون۔ وہ“

وہی۔ جس سے آپ ملنے جا رہے ہیں۔

”یہ یکا یک۔ تم اِس نتیجے پر کیسے پہنچ گئے۔ ابھی ابھی تو تمہیں اس پر صرف شک تھا۔“ ساجد نے حیران ہو کر پوچھا۔

”سر۔۔۔ مم۔۔۔ میرا۔۔۔“

”کیا بات ہے بھئی۔“ انسپکٹر ساجد حیران تھا۔

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ میرا بٹوہ۔۔“ سب انسپکٹر نے اپنی جیب اُلٹ کر دکھا دی جو خالی تھی۔ ”کیا“ انسپکٹر ساجد چلایا۔

انسپکٹر جمشید اپنے کمرے میں بیوی بچوں کے ساتھ بیٹھے آج کی حیرت انگیز واردات کے متعلق باتیں کر رہے تھے وہ کہہ رہے تھے۔

”جیب کترے واقعی بہت دیدہ دلیر ہیں۔“

”کیا آپ بھی نہیں دیکھ سکے۔“ فرزانہ نے پوچھا۔

”کیا نہیں دیکھ سکا۔ تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”جب لوگوں کی جیبیں کاٹی گئیں، اُس وقت آپ نے کسی کو کاٹتے ہوئے نہیں دیکھا۔“

”نہیں۔ میرے لئے بھی یہ اتنا ہی اچانک پیش آیا جتنا دوسروں کے لئے۔ دراصل میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ بھرے پرے ہال میں اس دیدہ دلیری سے واردات کر جائیں گے۔“ اُنہوں نے کہا۔

”اور اب سب انسپکٹر صاحب اپنے انسپکٹر کو لے کر یہاں آئیں گے۔“ فاروق نے لطف لے کر کہا۔

”ہاں! سب انسپکٹر کو تو ویسے بھی آنا پڑے گا۔“ انسپکٹر جمشید مسکرائے۔

”کیوں۔ یہ کس لیے کہہ رہے ہیں آپ۔“ محمود نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تم اتنا بھی نہیں سمجھتے۔ اسے ابا جان پر شک ہو گیا ہے۔“ فرزانہ نے کہا۔

”میں اتنا تو سمجھتا ہوں۔ لیکن ابا جان کے لہجے میں کوئی اور جھلک بھی تھی۔“ محمود بولا۔

”اب تمہیں لہجوں میں بھی جھلک نظر آئے گی۔“ محمود نے جل کر کہا۔

”تم میں جھلک نظر آتی ہے۔ بتاؤں کس قسم کی۔“ فاروق مسکرایا۔

”جی فرمائیے۔ ذرا میں بھی تو سنوں۔“ محمود نے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

”غصے کی۔۔۔“ فاروق بولا اور فرزانہ کھلکھلا کر ہنسی۔

”کھی کھی کرتی ہوئی تم بالکل اچھی نہیں لگتیں۔“ محمود اس کی طرف جھلا کر مڑا۔

"تو کیا ریں ریں کرتی ہوئی اچھی لگتی ہوں۔" فرزانہ نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

"تم تو لڑنے لگے۔ بات ہو رہی تھی سب انسپکٹر کی۔" آخر انسپکٹر جمشید نے دخل دیا۔

"جی ہاں۔ یہ دونوں تو یونہی بات کو کہیں سے کہیں گھسیٹ کر لے جاتے ہیں۔" محمود بول اُٹھا۔

"لو۔۔۔اب باتیں گھسیٹی جانے لگیں۔" فرزانہ کی کھی کھی پھر شروع ہو گئی۔

"فرزانہ۔ اُبری بات ہے۔ محمود تمھارا بڑا بھائی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے مسکراتے ہوئے ڈانٹا۔

"اوہ! ہاں۔ یہ تو میں بھول ہی گئی تھی۔"

"چلو شکر ہے۔ تمھیں یاد تو آیا۔" محمود ابھی تک غصے میں تھا۔

"اور فرزانہ۔ کہیں تم یہ بھی تو نہیں بھول گئیں کہ میں بھی تمھارا بڑا بھائی ہوں۔" فاروق ہنسا۔

"جی بھائی جان! مجھے بہت اچھی طرح یاد ہے۔"

"توبہ! ان تینوں کی زبانیں تو جملے گھڑنے کی مشینیں ہیں۔ بیگم جمشید بولیں۔"

"شکریہ! امی جان۔" تینوں ایک ساتھ بولے۔ انسپکٹر جمشید اور بیگم جمشید اپنی ہنسی کسی طرح نہ روک سکے۔

"اب ابا جان۔ آپ کہہ رہے تھے کہ سب انسپکٹر تو ویسے بھی آئے گا۔ اس کا کیا مطلب ہے۔؟"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی اپنی جیب کٹ گئی ہے۔" انسپکٹر جمشید نے انکشاف کیا۔

"کیا مطلب۔؟" ان کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔ عین اُسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ "محمود۔ دیکھو کون ہے۔"

"جی۔ اچھا۔" محمود نے اُٹھ کر دروزہ کھولا تو بیرا نظر آیا۔

"کیا بات ہے۔" محمود نے چونک کر پوچھا کیونکہ بیرے تو صرف بلانے پر ہی آتے ہیں۔

"وہ پولیس آفیسر آپ کے والد کو نیچے بلا رہے ہیں۔" بیرے نے کہا۔

انسپکٹر جمشید نے اس کے الفاظ سن لیے تھے لہٰذا وہ خود ہی بولے۔

"تم انہیں اوپر ہی لے آؤ۔" "جی۔" بیرا حیران رہ گیا۔

"ہاں بھئی۔ کہہ دو۔۔ اوپر ہی تشریف لے آئیں۔"

"جی اچھا۔" بیرے نے کہا اور سیڑھیاں اُترتا چلا گیا۔

"یہ آپ نے کیا کیا۔ اب سب انسپکٹر کا پارہ اور چڑھ جائے گا۔"

"یہی تو میں چاہتا ہوں۔"

"کیا مطلب۔؟" تینوں ایک ساتھ بولے۔

"یہ دیکھو۔ یہ کیا ہے۔" انسپکٹر جمشید نے جیب سے کوئی چیز نکالتے ہوئے کہا۔

"ارے۔ یہ بٹوہ آپ کا تو نہیں۔" محمود نے ان کے ہاتھ میں بٹوہ دیکھ کر کہا۔

"ہاں! یہ اس سب انسپکٹر کا ہے۔" "کیا" وہ حیران رہ گئے۔

"یہ آپ کے پاس کیسے آ گیا۔"

یہی وجہ تھی کہ میں نے کہا تھا سب انسپکٹر کو تو ویسے بھی آنا پڑے گا۔"

"آخر یہ آپ کو کیسے مل گیا۔" "میں نے اُس کی جیب سے نکالا ہے۔" "جی۔"

ان کی "جی" لمبی ہوتی چلی گئی۔ اس وقت دروازے پر ایک بار پھر دستک ہوئی۔ ☆☆☆

نیا سنسنی خیز ناول آپ پیاروں کیلئے

"راجا"

قسط نمبر 6

تحریر: سید صفدر رضا رضوی

یہ لوگ چوہدری حشمت علی کے آدمی ہیں اور یہ لوگ میرے بابا کے بھی قاتل ہیں اب مجھے بھی مارنا چاہتے ہیں کیوں کہ انہیں اپنے بابا کو خود قتل کرتے دیکھ لیا تھا۔ لڑکی کی بے سرو پا بات سن کر چوہدری شوکت علی کو غصہ آ گیا۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے احترام میں یہ الزام کیسے برداشت کر لیتا۔

"تم جانتی ہو کہ تم کیا کہہ رہی ہو چوہدری حشمت علی سے پہلے اس گاؤں کے مالک چوہدری ملک داد خان صاحب ہیں۔ ان کی موجودگی میں یہ کچھ کیسے ہو سکتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان پر جھوٹا الزام لگا رہی ہو"۔

چوہدری حشمت علی کے متعلق یہ سن کر وہ لڑکی حیرت سے سر اُٹھا کر بولی۔ "اے بابو تم کون ہو؟ کیا تمہیں معلوم نہیں ہے کہ چوہدری حشمت علی نے جائیداد پر قبضہ کرنے کے لیے چوہدری ملک داد جیسے انصاف پسند آدمی کو اپنی حویلی کی کال کوٹھڑی میں کب کا مروا دیا ہے۔ اور اب ان کے بعد ہی تو اپنے ظلم کی داستانیں لکھوا رہا ہے"۔

اس لڑکی کی بات سن کر چوہدری شوکت علی کے وجود کی عمارت میں زلزلہ سا آ گیا۔ قتل، ملک داد انصاف پسند، قاتل چوہدری حشمت لڑکی کے قتل کا فیصلہ، حملہ رات کی تنہائی گاؤں والوں کا مدد کو نہ آنا یہ سب چیزیں چوہدری شوکت علی کو اندر سے توڑنے لگیں۔

"میں لالی ہوں، راجو سپیرے کی بیٹی، میں اور میرا ابابا۔ دونوں گاؤں گاؤں تماشہ دکھانے پھرتے تھے۔ اور تماشے سے ملنے والی رقم سے اپنا گزارا کیا کرتے تھے۔ ایک دن اسی طرح گاؤں گاؤں گھومتے یہ لوگ ایک دن گاؤں جا پہنچے۔ میرا ابابا چونکہ میری طرح ہی بچپن سے سانپوں کے درمیان کھیلا تھا لہٰذا ایسے سانپوں کے متعلق بہت معلومات تھیں۔ سانپ کی کھنچلی دیکھ کر اور انڈے دیکھ کے چھلکے دیکھ کر سانپوں کی تمام تر نسلوں اور خصوصیات کا بتا دیا کرتا تھا۔ کیوں کہ ہم لوگ خاندانی سپیرے تھے گاؤں سے گزرتے ہوئے بابا نے سانپوں کے ایک جوڑے کو دیکھ کر انتہائی حیرت کا مظاہرہ کیا۔ وہ سانپ لمبائی میں قریب دو سے اڑھائی میٹر لمبے اور سیاہ چمکدار کھال والے تھے ابا نے مجھے بتایا کہ یہ سانپوں کے سردار ہیں اور بہت لمبے عرصے بعد زمین سے باہر نکلتے ہیں۔ وہ رہنے کے لیے ایسی ویران جگہوں کا انتخاب کرتے ہیں کہ جہاں کسی انسان کی رسائی نہ ہو سکے۔ وہ سانپ اچانک نظروں سے اوجھل ہوئے تو بابا نے اپنی بین نکال کر منہ سے لگائی۔ بین کی آواز کے ہوا میں پھیلتے ہی کسی جانب سے دونوں سانپ پھنکارتے مارتے ہوئے سامنے آ گئے۔ ان کے لمبے چوڑے جسم کو دیکھ کر مجھے خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ بابا نے اشارے سے مجھے دور ہٹنے کو کہا تو میں قریبی محفوظ جگہ پر کھڑی ہوئی۔ بابا آہستہ آہستہ بین کی آواز تیز کر رہا تھا اسی طرح سانپوں کے جھومنے کی رفتار بھی تیز ہو رہی تھی۔ جیسے وہ مدہوش ہو رہے ہوں۔ میں بابا کے

پھولتے پچکتے گالوں کو دیکھ رہی تھی جانے کتنی دیر تک بین کی گونجتی رہی یہاں تک کہ میں خود اپنے اردگرد سے بے خبر ہوگئی۔ اچانک بابا کی خوشی اُبھرتی چیخ سن کر میں چونکی، بابا کے ہاتھوں میں ایک سانپ مچل رہا تھا جب کہ دوسرا بین کی آواز کی لے ٹوٹتے ہی کہیں غائب ہوگیا۔ بابا نے جلدی سے مجھے تھیلا کھولنے کو کہا تو نے اپنی گھٹڑی میں موجود ایک چھوٹا اور میلا سا تھیلا کھولا بابا وہ سانپ لپیٹ کے بل سے اس میں ڈالا اور پھر اس منہ چھوڑتے ہی تھیلے کو بند کر ڈالا۔ بابا کا جوش وجذبہ بالکل نیا تھا اور تھیلا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ اچانک بابا ہنسنے لگا۔ لالی بیٹی خدا کا شکر ادا کر۔ اب ہم، تو ،سب امیر ہو جائیں گے۔ دنیا جہاں کی دولت تجھے اور تیرے بابا کو مل جائے گی۔ بابا کی خوشی دیدنی تھی میں بابا کے کہے ہوئے بولوں کی خوشبو میں کھوسی گئی تھی۔ نئے کپڑے چنری لیول اور پکے مکان کا خوبصورت خیال۔

بابا کیا ہوگیا ہے تجھے کیا تو نے پہلی مرتبہ کوئی سانپ پکڑا ہے۔ میں بولی تو بابا ہنستے ہوئے جواب دیا۔ اری او بھاگوان میری ساری زندگی کے پکڑے ہوئے سانپ نیولے ایک طرف اور یہ دھاری والا لمبا سانپ ایک طرف افسوس میں صرف ایک ہی سانپ پکڑ سکا۔ بہر حال بین کی لے ٹوٹنے پر میں ایک ہی یا تو چلا سکتا تھا۔ یہ سانپ اپنے جوڑے کے بغیر نہیں رہتا ہے لہٰذا جلد ہی دوسرا مل جائے گا۔ پر اب تو دیکھنا میں کیا کروں گا۔ تو نے سانپ کا منکا تو سنا ہوگا ناں" بابا نے مسکرا کر پوچھا تو میں بے فکری سے بولی

"ظاہر ہے ایک سپیرے کی بیٹی ہوں ضرور سنا ہوگا۔ اچھا تو پھر سن لے کہ منکا اسی سانپ کے جوڑے کے پاس ہوتا ہے یہ اپنے بل میں وہ منکا چھپائے رکھتے ہیں۔ اور اس منکے کے ساتھ ہی کچھ نایاب ہیرے موتی بھی ہوتے ہیں کہ جو منکے کی تاثیر سے قیمتی ترین بن جاتے ہیں۔ اب یہ سانپ ہی مجھے اس منکے پاس لے کر جائے گا جہاں بہت سارے ہیرے جواہرات بھی ہمیں مل جائیں گے۔ بابا کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھی، وہ بہت خوش تھا ظاہر ہے ایک خزانہ ملنے کی آس جو پیدا ہوگئی تھی اسے۔ مگر بابا ہم دولت کا کیا کریں گے چھوڑ دولت کو ہمارے پاس سکون کی دولت ہے جو بہت ہے۔ اللہ کے کرم سے جو ملتا ہے صبر شکر کر کے کھا لیتے ہیں۔ نہ لٹنے کا ڈر رہتا ہے اور نہ لٹ جانے کا۔ چل بابا چھوڑ اس سانپ کو آگے چلتے ہیں۔

میرے کہنے پر بابا بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا اس کی خوشی کا اہم مرکز وہ سانپ تھا۔ اور بخدا میں بھی اپنے بابا کو پہلے اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ ہم لوگ باتیں کرتے کرتے چوہدری حشمت علی کے گاؤں میں آگئے جہاں پہلے دن بابا نے تماشے کے دوران منکے والا سانپ نکال کر دوسرے سانپ کے سامنے ڈال دیا۔ نیولے اور سانپ کی لڑائی تو گاؤں کے بچے بچے نے دیکھی ہوگی مگر سانپ سے سانپ کی خون ریز لڑائی دیکھ کر سارا گاؤں وہاں اکٹھا ہوگیا تھا ۔ ہمارے تماشے کے بعد بہت ساری لوگوں نے ہمیں حسب استطاعت پیسے، اناج اور پھل دیئے گویا تماشہ لوگوں کو اچھا لگا تھا ۔ بابا نے مرنے والے سانپ کے مردہ وجود کو دھو کر ایک زمین میں گاڑ دیا تھا۔ جب کہ وہ دھاری دار سانپ پٹاری میں بند کر دیا تھا بابا نے کچھ لوگوں کے پوچھنے پر بتایا کہ یہ سانپ انتہائی نایاب ہے اس کے ساتھ ساتھ خطرناک بھی۔ اس سانپ کے کاٹے آدمی جو زہر کی وجہ سے مدہوشی کا اثر ہو جاتا ہے۔ اور اگر ایک گھنٹے کے عرصے تک سانپ کی کاٹی جگہ سے زہر نہیں نکالا

جائے تو وہ بے ہوش آدمی پھر ہوش میں نہیں آتا۔ اور زہر نکالنے کے لیے بھی اسی سانپ کو کاٹی جگہ سے زہر چوس کر نکالنا ہوتا ہے ورنہ اس آدمی کو موت یقینی ہوگی۔ گویا یہ سانپ ہی آدمی کی زندگی دوبارہ لوٹا سکتا ہے۔ بابا کی باتیں سن کر گاؤں کے بھولے بھالے لوگوں میں سے کچھ ہنسنے لگے سر ہلا کر چل دیئے۔

بابا وہیں ایک جگہ جنگل میں موجود لکڑیوں کی مدد سے ایک جھونپڑی بنالی اور چھت کے طور پر پرانی چادروں کا استعمال کر کے رہنے کے قابل جگہ بنالی ہم لوگ اسی جھونپڑی میں چادر بچھا کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔ رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ جب چند آدمی ہماری جھونپڑی تک آئے اور ہمیں اٹھا کر بولے چلو چودھری حشمت علی نے تمہیں بلایا ہے۔ بابا اور میں چونکے ضرور تھے مگر گاؤں کے چوہدری کا حکم ماننا بھی ضروری تھا اس لیے بابا نے اپنا ضروری سامان سنبھالا اور ہم ان آنے والے آدمیوں کی راہنمائی میں حویلی تک آگئے۔ گاؤں والے سرشام ہی سونے کے عادی تھے۔ اتنی رات کو ظاہر ہے سارا گاؤں سو رہا تھا۔

ایک کمرے میں چوہدری حشمت علی ٹہل رہا تھا۔ بابا اور مجھے دیکھتے ہی وہ مسکرا دیا اس کی خبیث مسکراہٹ کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح تھی ۔ ابھی ہمیں پہنچنے کی دیر تھی کہ جھونپڑی میں پڑا ہمارا باقی رہ جانے والا سامان بھی وہاں پہنچا دیا گیا۔ وہ ٹپاری دیکھ کر چوہدری حشمت علی کی آنکھیں پھیل گئیں ۔ اچھا تو اس میں ہے وہ سانپ چلو اس کرشمہ بھی دیکھ لیتے ہیں۔ چوہدری حشمت علی وہ ٹپاری لے کر اندرون حصے میں چلا گیا تھوڑی دیر بعد حویلی کے اندرون حصوں سے کسی کے چیخنے کی آوازیں برآمد ہوئیں تو میں نے گھبرا کر اپنے بابا کا بازو تھام لیا۔ بابا کے پاس یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ مگر میری بات کا تسلی بخش جواب بابا کے پاس نہیں تھا اس لیے وہ چپ رہا۔ اچانک جیسے پوری حویلی جاگ گئی ہو۔ چند نوکروں نے آن کر مجھے اور میرے بابا کو دبوچ لیا۔ ہم اس افتاد سے گھبرا گئے اسی وقت کمرے میں چوہدری حشمت علی داخل ہوا اس کے ساتھ ساتھ اپنے سر کے بالوں کو نوچتی بڑی چوہدرائن مقبول بیگم بھی تھیں ۔ اماں یہی ہے وہ سپیرا کہ جس نے حویلی میں چوری کی نیت قدم رکھا اور بڑے چوہدری صاحب کو اس زہریلے سانپ سے ڈسوا دیا ۔ یہی وہ سپیرا اسے ماروا سے چھوڑنا نہیں چوہدری حشمت علی مگر مچھ کے آنسو بہاتے ہوئے ہم دونوں پر بے بنیاد اور جھوٹے قتل کا الزام لگا دیا تھا۔ بھلا ہم اس حویلی میں کیوں اور کیسے گھستے اور وہ بھی چوری کی نیت سے استغفراللہ، پھر اسی وقت کلہاڑی کے پھل چمکے اور میرے بابا کی گردن اس کے جسم سے کٹ کر میرے سامنے گر کر اچھلنے لگی ۔ گرم گرم ابلتا سرخ خون اچھل کر میرے چہرے پر بھی آن گرا اور یہ دہشت ناک منظر دیکھ کر میں خوف سے چیخ مار کر اپنے ہوش کھو بیٹھی۔

لالی زور زور سے رو رہی تھی جب کہ چوہدری شوکت علی اپنے والد کے قتل کی سازش کا سن کر اندر ہی اندر تڑپ رہا تھا۔ کیا واقعی اس کا ماں جایا چوہدری حشمت علی صرف دولت اور جائیداد پانے کے لیے اپنے باپ کا خون کر سکتا ہے ۔ یہ خیال آتے ہی چوہدری شوکت علی کی آنکھیں بھیگنے لگیں کہ بڑے چوہدری صاحب اس دنیا میں نہیں رہے تھے ۔ لالی جب اچھی طرح رو چکی تو پھر آگے بولی ، میں جب ہوش میں آئی تو کسی قید خانے میں بند تھی بدبو اور گھٹن کی وجہ سے میرا سانس لینا محال تھا۔ قبل اس کے کہ میں گھٹن سے جاں بلب ہوتی۔ کوئی قید خانے کا دروازہ کھول کر نیچے آیا۔ (جاری ہے)

سخاوت کا کوٹا

تحریر: اِشتیاق احمد

انتخاب: محمد شاہد حفیظ۔ میلسی

ماہنامہ کرن کرن روشنی کے "انتخاب نمبر" کے لیے بچوں کے نامور ادیب جناب اشتیاق احمد رحمۃ اللہ علیہ کی کہانی "سخاوت کا کوٹا" حاضر خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ کو پسند آئے گی۔

"انتخاب نمبر" کے لیے میں نے کوشش کی ہے کہ نسبتاً پرانی کہانی منتخب کروں کیونکہ نئی کہانیاں تو آج کل کے تمام قارئین نے پہلے سے پڑھی ہوں گی، پرانی کہانی کی تلاش میں، میں نے ماہنامہ "چاند ستارے" لاہور (جناب اشتیاق احمد کا شائع کردہ پہلا میگزین جو چند سال کی اشاعت کے بعد بند ہو گیا تھا) کے 1992ء کے چند شمارے دیکھے مگر ان میں اشتیاق صاحب کے قسط وار ناول تو موجود تھے مگر مختصر اور مکمل کہانی نہ مل پائی پھر مجھے ماہنامہ ہمدرد نونہال کراچی (اگست 1997ء) کے خاص نمبر میں یہ کہانی ملی جو مجھے تب سے اَب تک یاد رہی ہے۔ لہٰذا یہی کہانی منتخب کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہے امید ہے کہ آپ کو بھی پسند آئے گی اور قارئین بھی اسے پسند کی سند سے نوازیں گے۔ اللہ تعالیٰ اشتیاق احمد رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ (آمین)

"یہ کیا، میں نے تو آپ سے سادہ پانی کا گلاس مانگا تھا آپ نے شربت کا گلاس میرے ہاتھ میں تھما دیا۔"

شربت کی ریڑھی کے پاس کھڑے اس غریب آدمی نے یہ الفاظ گھبرائے ہوئے لہجے میں کہے۔ شربت والا مسکرا دیا اور بولا:

"کوئی بات نہیں، آج آپ شربت پی لیں۔"

"لیکن جناب! میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔"

"اوہ! خیر کوئی بات نہیں، آپ یہ شربت پی لیں۔ میں آپ سے پیسے نہیں مانگوں گا۔"

"کیا واقعی؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"بس یہ کسی طرح ہو سکتا ہے۔ آپ پی لیں۔"

اس نے ڈرے ڈرے انداز میں گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ چلچلاتی دھوپ میں شدید پیاس کی حالت، خالی جیب کے ہوتے ہوئے، شربت روح افزا کا گلاس اسے آبِ حیات محسوس ہوا اور وہ غٹا غٹ پی گیا۔ پھر ڈرے ڈرے انداز میں اس نے گلاس ریڑھی پر رکھ دیا اور بولا:

"کک...... کیا میں جا سکتا ہوں؟"

"ہاں! کیوں نہیں، ضرور جا سکتے ہو۔"

"اور شربت! آخر یہ آپ نے مجھے مفت کس خوشی میں پلا دیا جب کہ میں روز اسی وقت اس چلچلاتی دھوپ میں یہاں سے گزرتا ہوں، پیاس کے مارے میرا برا حال ہوتا ہے، نلکوں میں سے گرم پانی بھی پینے کو نہیں ملتا۔ میں نے کل بھی آپ سے سادہ پانی کا ایک گلاس مانگا تھا۔ آپ نے جواب دیا تھا کہ پانی نلکے سے پی لو۔ پھر آج آپ نے یہ کیا؟ یہ آپ اچانک اتنے سخی کیسے ہو گئے؟"

"بھائی! سادہ پانی کا ایک گلاس ملے گا۔"

"ضرور کیوں نہیں۔" شربت والا اسے بھول کر نئے آنے والے کی طرف متوجہ ہو گیا اور اسے بھی شربت کا گلاس بنا کر تھما دیا۔

"ارے ارے، یہ کیا بھائی صاحب! میں نے سادہ پانی مانگا تھا۔"

"کوئی بات نہیں، شربت پی لیں"۔

"میں غریب آدمی ہوں، آٹھ نو روپے کا شربت نہیں پی سکتا۔ شربت پیوں گا تو بچوں کو کہاں سے کھلاؤں گا۔"

"میں نے کہا نا پی لو۔ پیسے نہیں مانگوں گا تم سے۔" شربت والا بولا

"کک...... کیا مطلب، کیا واقعی؟" اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

"ہاں واقعی پی لو۔"

اس نے بھی گلاس منہ سے لگا لیا اور گلاس خالی کر کے حیرت زدہ سا آگے بڑھ گیا۔

"وہ تم سے بعد میں آیا اور شربت پی کر چلا گیا اور تم ابھی تک یہیں کھڑے ہو، جاؤ اپنا کام کرو۔"

"بھائی صاحب! ایک گلاس شربت۔" ریڑھی پر اس بار ایک گاہک آ کھڑا ہوا۔

"ضرور جناب!" اس نے کہا اور شربت بنا کر دے دیا۔ گاہک نے شربت پیا اور گلاس خالی کرتے ہوئے بولا:

"جی کتنے پیسے ہوئے؟"

"دس روپے۔" شربت والا بولا۔

دس روپے دے کر وہ آگے چلا گیا۔ شربت والا پھر اس کی طرف مڑا۔

"جاؤ بھائی! جاتے کیوں نہیں۔"

"جب تک آپ مجھے بتائیں گے نہیں میں نہیں جاؤں گا۔" اس نے کہا۔

اس وقت ایک اور سادہ گلاس مانگنے والا آ دھمکا۔ ساتھ ہی شربت پینے کے لیے تین چار آدمی آ کر رکے۔ شربت طلب کرنے والوں سے اس نے دس دس روپے لیے اور جس نے پانی مانگا تھا اسے شربت پلا کر حیرت زدہ انداز میں رخصت کر دیا، لیکن وہ جوں کا توں کھڑا رہا۔

"آپ ابھی تک گئے نہیں۔"

"وجہ معلوم کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔" اس نے منہ بنایا۔

"اور بھی تو ہیں جو پیاس بجھا کر حیرت کرتے ہوئے جا چکے ہیں۔"

"ہر آدمی کا اپنا مزاج ہوتا ہے۔"

اسی وقت ایک اور سادہ پانی مانگنے والا آ گیا۔ اس طرح وہ تقریباً ایک گھنٹے تک وہاں کھڑا رہا۔ ایک اور نے سادہ پانی مانگا۔ شربت والے نے فوراً کہا:

"پانی نلکے سے، شربت ریڑھی سے۔"

"نلکوں میں پانی کہاں! اگر ہو گا بھی تو گرم۔" نیا آنے والا جل کر بولا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ بھونچکا رہ گیا۔

"اب آپ نے یہ کیا کیا۔"

"سخاوت کا کوٹا ختم۔" شربت والا ہنسا۔

"کیا مطلب؟" اس نے حیران ہو کر کہا۔

"میرا دماغ نہ چاٹیں اور اگر زیادہ بے چینی ہے تو کل پھر آ جانا بتا دوں گا۔"

وہ مجبوراً آگے بڑھ گیا۔ معاملہ اس کے پلے بالکل نہیں پڑا تھا۔ حیرت نے اسے پوری طرح جکڑ لیا تھا۔ دوسرے دن وہ اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر گھر کی طرف روانہ ہوا اور بالکل اسی وقت

شربت کی ریڑھی کے پاس پہنچ گیا۔دھوپ آج بھی چلچلا رہی تھی

"ایک گلاس سادہ پانی۔"

شربت والا اسے دیکھ کر مسکرایا اور پھر شربت کا گلاس اسے تھما دیا۔

"میری جیب میں شربت کے لیے پیسے نہیں ہیں۔"اس نے گویا اسے خبردار کیا۔

"کوئی بات نہیں۔"

"تو کیا آج پھر کوٹا جاری ہے؟"وہ بولا۔

"ہاں یہی بات ہے۔"

وہ غٹا غٹ شربت پی گیا۔گلاس اسے تھما کر بھی وہ وہیں کھڑا رہا۔

"تو آج آپ یہ جان کر جائیں گے کہ یہ سب چکر کیا ہے؟"

"ہاں بالکل۔"اس نے فوراً کہا۔

"ٹھیک ہے،میں نے اجازت لے لی ہے۔"

"جی اجازت!کیس اجازت؟"

"وہ سامنے ریسٹورنٹ دیکھ رہے آپ۔"اس نے سڑک کے دوسری طرف اشارہ کیا۔

"جی،جی ہاں۔"اس نے فوراً کہا۔

"آپ کو شیشے کی دیوار کے دوسری طرف ایک صاحب بیٹھے نظر آرہے ہیں۔وہ کچھ لکھ رہے ہیں۔"

"ہاں بالکل۔"

"ان کے پاس چلے جائیں۔وہ آپ کو بتا دیں گے۔"

"کیا بتا دیں گے؟"

"میرا مطلب ہے جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔"

"کیا؟کیا آپ سنجیدہ ہیں؟میں واقعی ان کے پاس چلا جاؤں۔"

"ہاں ہاں،اس لیے کہ جب میں نے آپ کا ذکر ان سے کیا تو وہ بہت خوش ہوئے تھے۔وہ آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"اوہ اچھا۔"

وہ حیرت زدہ سا اس طرف چل پڑا۔اس نوجوان کے پاس پہنچ کر وہ کھنکارا۔

"معاف کیجیے گا جناب!میں آپ سے بلکہ آپ مجھ سے ملنا چاہتے تھے۔"

اس نوجوان نے چونک کر اپنا قلم روک دیا۔ورنہ اس سے پہلے وہ کچھ لکھ رہا تھا اس کا قلم تیزی سے چل رہا تھا۔

"تشریف رکھیے۔خوشی ہوئی کہ آپ آئے۔آپ کا آنا اس بات کی علامت ہے کہ ہماری قوم ابھی زندہ ہے۔"

"جی،میں سمجھا نہیں۔"وہ دھک سے رہ گیا اور اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

"میں ایک کہانی نگار ہوں۔کہانی نگار ہونے کا مطلب یہ کہ وہ دوسروں کا درد خوب محسوس کرتا ہے۔میں بہت غریب تھا۔بہت زیادہ غریب۔اپنی ڈیوٹی سے فارغ ہو کر جب چلچلاتی دھوپ میں گھر کی طرف جاتا تو راستے میں شربتوں،تربوزوں اور سوڈا واٹر کی دکانیں میرا دل تڑپا دیتیں۔میرا جی چاہتا کہ ایک بڑا لمبا گلاس ٹھنڈے شربت کا خرید کر غٹا غٹ پی جاؤں،لیکن دل تھام کر رہ جاتا۔صبر کے گھونٹ پی کر گزارا کر لیتا۔ایسے سانپ روز میرے سینے پر لوٹتے،لیکن میں ان سانپوں سے چھٹکارا پانے کے لیے کچھ بھی نہیں کر پاتا تھا۔اسی کرب نے،اسی بے چینی نے،اسی تڑپ نے،اسی چبھن نے،اسی الاؤ نے ایک دن مجھے کہانی نگار بنا دیا۔آج میرے پاس دولت ہے،لیکن آج ان دکانوں کے پاس سے،ان ریڑھیوں کے پاس سے گزرتے ہوئے مجھے پیاس

کا احساس تک نہیں ہوتا۔پانی یا شربت کی بالکل مجھے ضرورت محسوس نہیں ہوتی،لیکن آج بھی دنیا اسی طرح ہے۔نہ جانے کتنوں کا دل ان دکانوں کے پاس سے گزرتے ہوئے تڑپتا ہے۔میں ان تڑپتے دلوں پر ایک کہانی لکھنا چاہتا تھا،لیکن میں نے سوچا ایسی کہانی کا کیا فائدہ جو عمل سے خالی ہو۔لہٰذا پہلے عملی طور پر اس تڑپ پر عمل کیا،ایک سو روپے کا نوٹ شربت والے کو کل دیا تاکہ وہ ایسے دس آدمیوں کو شربت کا گلاس پلا دے جو سادہ پانی مانگتے ہیں اور جنہیں ریڑھی سے،سادہ پانی بھی نصیب نہیں ہوتا۔اس طرح بغیر مانگے پانی کی بجائے شربت ملنے سے اس کو حیرت اور خوشی ہوتی تھی،اس سے مجھے بڑا سکون ملتا ہے۔کیا آپ کچھ اور پوچھنا چاہتے ہیں؟"

"نن......نہیں،نہیں میں سمجھ گیا۔ساری بات سمجھ میں آ گئی۔"

"اور شربت،سوڈا واٹر یا چائے پینا پسند کریں گے آپ؟"اس نے کہا۔

"نہیں،ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔اس نے نہایت گرم جوشی سے ہاتھ ملایا اور ریسٹورنٹ سے نکل آیا۔دوسرے دن جب وہ ریڑھی کے پاس سے گزرنے لگا تو پہلے اس کی نظریں ریسٹورنٹ پر پڑیں۔وہ کہانی نگار وہاں نہیں تھا۔اس نے ڈرتے ڈرتے شربت والے سے کہا:

"ایک گلاس سادہ پانی ملے گا؟"

"ہاں ضرور،کیوں نہیں۔کیا میں اتنا بھی نہیں کر سکتا"۔

شربت والے نے کہا اور سادہ پانی کا ایک گلاس اسے تھما دیا۔

............☆☆............

(بقیہ: تبدیلی آئی ہے)

اب ہم نے خود اُنہیں ایک پلیٹ میں بریانی ڈال کر دی۔۔لیکن اُنہوں نے اس کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔۔۔اسی طرح ان کے اپنے ایک دوست ہی، سرکاری افسر ہیں۔۔تنخواہ تو ان کی زیادہ نہیں لیکن۔۔۔لیکن پھر بھی ان کے گھر میں ہر چیز کی ریل پیل ہے۔۔لگتا ہے لاکھوں کماتے ہیں، اُن کے گھر سے کوئی چیز آجاتی ہے تو ہرگز نہیں کھاتے۔۔یہ لوگ اُنہیں اپنے گھر دعوت پر بلاتے ہیں تو معذرت کر لیتے ہیں۔۔۔مگر کسی عزیز کے گھر کسی ضرورت کے تحت جانا پڑ جائے اور وہ پینے کے لئے کچھ منگانا چاہیں تو اُنہیں روک دیتے ہیں۔اس طرح سب لوگ ابا جان سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔۔۔لیکن اُنہیں اس بات کی کوئی پرواہ نہیں۔۔کوئی ڈاڑھی والا ان سے ملاقات کے لیے آجائے تو لپک کر اس کا استقبال کرتے ہیں۔۔

ہمارے دوست احباب کو دیکھ کر بڑے بڑے منہ بنانے لگتے ہیں۔

ایک دن مجھ سے ایک مولانا ٹائپ نوجوان ملنے کے لئے آگیا اُسے میرے ساتھ دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔۔گرم جوشی سے ملے۔۔اُس کے جانے کے بعد پُر جوش انداز میں کہنے لگے ۔۔''تمہارے اُس دوست کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔۔ایسے دوست بنایا کرو'' میں نے اُن کی بات سُن کر کہا۔

ابا جان! وہ میرے دوست نہیں ہیں۔کسی کام سے آئے تھے۔یہ سُن کر اُن کا چہرہ بجھ سا گیا۔جیسے بہت صدمہ ہوا ہے۔اب بھلا یہ بات بھی کوئی صدمے کی بات ہے۔بس اِس قسم کی باتیں ہیں، جن کی وجہ سے ہم اُن سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔۔وہ اپنے اندر رونما ہونے والی باتوں کی وضاحت بھی کرتے ہیں۔لیکن ہمارے لیے اِس قسم کی باتوں میں اول تو کوئی دلچسپی نہیں، دوسرے ہم ان باتوں کو سمجھ بھی نہیں پائے۔۔۔میرا خیال ہے۔۔وہ ضرورت سے کچھ زیادہ وہمی ہوگئے ہیں۔ہر چیز میں شک کرنے لگے ہیں۔۔اللہ ان پر رحم فرمائے۔۔۔اور ہاں کسی شعر کا ایک مصرعہ اکثر گنگناتے رہتے ہیں۔'' اور وہ مصرعہ کیا ہے۔''

''یہ بندہ تو سارے جہاں سے خفا میرے لیے ہے۔

''اوہ۔۔۔اوہ۔۔۔ارشد نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا اور جانے کے لئے اُٹھ کھڑا ہوا۔وہ کسی گہری سوچ میں ڈوب چکا تھا۔

''ارے۔۔۔ارے کہاں چل دیے۔۔کیا ہو گیا ہے تمہیں۔؟''

ارشد نے جیسے اُس کی آواز سنی بھی نہیں۔۔دروازہ کو کھولا اور باہر نکل گیا۔

بقیہ: دوسرا مالک

نے کہا: ''بیٹے پہلے اس دکان کا مالک کوئی اور تھا۔۔وہ عام دنوں میں تو نماز پڑھتا تھا لیکن رمضان میں صرف اپنی دُکان کا بن کر رہ جاتا تھا۔۔نہ مسجد میں نمازیں ادا کرتا۔۔نہ تراویح۔۔بس اللہ تبارک تعالیٰ کو اس کا ایسا کرنا شاید ناگوار گزرا۔۔اور اِس کی دُکان کے گاہک کم ہونے لگے۔۔۔ہوتے ہوتے ایسا ہوا کہ دُکان میں اُلو بولنے لگے۔۔۔مجبور ہو کر اُس نے یہ دُکان فروخت کردی۔۔!''

''اوہ۔۔اُدکان فروخت کردی!''

''ہاں۔۔۔اور اِس دُکان دار نے خرید لی جس سے میں نے ابھی تمہیں ملوایا ہے۔''

''اب میں سمجھا۔۔تو اسی لیے آپ میری توجہ اس دُکان کی طرف دلا رہے تھے۔''

''ہاں۔۔یہ وجہ بھی تھی اور ایک اور وجہ بھی۔۔۔'' یہ کہہ کر اُنھوں نے سرد آہ بھری۔

''اور کیا وجہ تھی دادا جان۔؟''

''اور وہ وجہ یہ ہے میرے بچے کہ اِس دُکان کا وہ پہلا مالک دراصل میں تھا۔''

''کیا! کیا کہا دادا جان!''؟

مارے حیرت کے توقیر کے منہ سے نکلا، وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُن کی طرف دیکھ رہا تھا۔